مکتوبات

مرزا مظہر جانجاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ

مرتب و مترجم:

خلیق انجم

مکتوبات

مرزا مظہر جانجاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ

متوفی

مع سوانح عمری

مرتب و مترجم :

خلیق انجم

مکی دار الکتب ◎ ۵۔ یوسف مارکیٹ
غزنی سٹریٹ
اردو بازار۔ فون : ۷۲۴۱۷۷۸
لاہور

حوالہ نمبر م - د / 97 - 14/ 41

کتاب : مکتوبات مرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ
مرتب : خلیق انجم
اشاعت : دسمبر 1997ء
مطبع : حاجی حنیف اینڈ سنز' لاہور
تعداد : 500
اہتمام : محمد عباس شاد
ناشر : محبوب الرحمٰن انور
برائے : مکی دارالکتب لاہور فون 7241778
قیمت : -/140 روپے

فہرست مضامین

دیباچہ

مغل حکومت کے دورِ آخر میں مذہب اور اخلاق بھی سیاسی زوال کے شکار ہو گئے تھے۔ تصوّف کو انفرادی نجات حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ بعض دنیا پرستوں نے عیش و عشرت اور جنسی بے راہ رویوں کو تصوف میں اس طرح خلط ملط کر دیا کہ حرم و میکدہ اور رند و زاہد کی تفریق مٹ گئی۔ اس وقت چند ذی شعور، خدا ترس اور باہمت بزرگوں نے ایمان، صداقت اور سچائی کے ایسے چراغ روشن کئے جن سے فسق و فجور کی یہ تاریکیاں دور ہو گئیں۔ ان بزرگوں میں شاہ ولی اللہ، خواجہ میر دردؔ اور مرزا مظہر جانجاناں قابل ذکر ہیں

مرزا مظہر اٹھارھویں صدی عیسوی کے سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگوں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ان کی خانقاہِ ارشاد نے اخلاقی اور روحانی اقدار کو فروغ دینے میں ناقابلِ فراموش رول ادا کیا ہے۔

مرزا صاحب کو خدا نے کچھ ایسا مزاج اور ایسی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں کہ وہ جس میدان میں بھی گئے امام بن کر رہے۔ اردو شاعری میں انھیں "نقاش اوّلِ ریختہ" کہا جاتا ہے۔ انھوں نے جب میدانِ شاعری میں قدم رکھا تو اردو شاعری ایہام جیسے ستم کے خارزاروں میں الجھی ہوئی صرف الفاظ کی جادوگری بنی ہوئی تھی۔ انھوں نے ہی اس خلاف فطرت تصنّع اور بناوٹ

کے خلاف آواز بلند کی اور سادہ گوئی کی بنیاد رکھی۔ جس کا اکثر تذکرہ نگاروں نے اعتراف کیا ہے۔ اس لئے انھیں "طبستانِ دلی" کا امام کہنا بے جا نہ ہوگا۔

مرزا صاحب کی ادبی یا مذہبی شخصیت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ان خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ کیوں کہ ان کی اور کوئی نثری تصنیف نہیں ہے۔ صرف یہی خطوط ہیں جو مرزا صاحب کے عقائد و نظریات، ذہن اور شخصیت کو سمجھنے میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔ ان خطوط ہی سے ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب مغل حکومت کی سیاست میں نمایاں حصہ لیتے تھے اگرچہ عملی طور پر انھوں نے فحبۂ دنیا سے نجات پالی تھی لیکن انسانی فلاح و بہبود کے خیال سے وہ ملکی سیاست میں ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے۔ اور جہاں تک ممکن ہوا امراء و رؤسا کو مشورے دیتے رہے۔

ان خطوط کے ترتیب دینے اور ترجمہ کرنے میں جن احباب سے مجھے مدد ملی ہے ان میں جناب نورالحسن انصاری، نثار احمد فاروقی صاحب، رشید حسن خاں صاحب اور اسلم پرویز صاحب کا شکریہ ادا کرنا میرا خوشگوار فرض ہے۔ جناب عبدالرزاق قریشی مؤلف مرزا مظہر جانجاناں کی عنایتوں کا بھی شکرگزار ہوں۔ اگر نیشنل میوزیم نئی دلی کے انچارج بخاری صاحب اور اقبال صاحب کا کرم شامل نہ ہوتا تو یہ مجموعہ مرزا صاحب کے دو نادر خطوط سے محروم رہ جاتا۔

اپنے بزرگ اور سرپرست مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا ممنون ہوں جنہوں نے نہ صرف اس کام کا حکم دیا بلکہ اس کی اشاعت میں بھی پوری دلچسپی لی۔

خلیق انجم
انجم لاج۔ کلاں محل۔ دہلی
۱۵ر دسمبر سنہ ۱۹۶۱ء

سلسلۂ نسب

مرزا صاحب نے ایک خط میں اپنے سلسلۂ نسب کے بارے میں لکھا ہے۔ اِس خاکسار کی نسبت اٹھائیس واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے شیر بیشۂ کبریا علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا تک پہنچتی ہے[1] [2]۔ والہ داغستانی نے بھی اپنے تذکرے "ریاض الشعراء" میں یہی لکھا ہے کہ مرزا صاحب "سادات علویہ" سے تھے[3]۔ والہ داغستانی کے اِس بیان پر اعتراض کرتے ہوئے مصحفی کہتے ہیں کہ "والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب ساداتِ علویہ سے تھے۔ یہ محض غلط ہے کیونکہ صحیح قول کے مطابق مرزا "اتراکِ توران" سے تھے[4]۔ پتا نہیں مصحفی کا ماخذ کیا ہے۔ لیکن خود

۱۔ مرزا صاحب کے تمام خطوط فارسی میں ہیں میں نے جہاں کہیں اُن کے خطوط کا حوالہ دیا ہے اُس کا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ (خ-ا)

۲۔ محمد علی مرادآبادی (مرتب) کلماتِ طیبات، مطبع مطلع العلوم، ۱۸۹۱ء۔

۳۔ والہ داغستانی، ریاض الشعراء (قلمی)، رضا لائبریری، رام پور ص ۵۰۴۔

۴۔ غلام ہمدانی مصحفی، عقدِ ثریا، اورنگ آباد، ۱۹۲۷ء ص ۵۵۔

مرزا صاحب کے اپنے بیان کے بعد اس سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

شجرۂ نسب

مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے مرزا صاحب کا شجرۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے :

"مرزا مظہر جان جاناں ابن مرزا جان ابن مرزا عبدالسبحان ابن مرزا محمد امان ابن شاہ بابا سلطان ابن بابا خان ابن امیر غلام محمد ابن امیر محمد ابن خواجہ رستم شاہ ابن امیر کمال الدین"[۱]

امیر کمال الدین

امیر کمال الدین نویشت اوپر مرزا صاحب کے جدِ اعلیٰ تھے۔ یہ کسی کام کے سلسلے میں طائف سے ترکستان آئے۔ وہاں قاقشالان کے سردار کی لڑکی سے اُن کی شادی ہوگئی۔ چونکہ اس سردار کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی اس لئے حکومت امیر کمال الدین کو مل گئی۔

بابا خاں اور مجنوں خاں

ہندوستان میں لکھی گئی تاریخوں میں بابا خاں اور مجنوں خاں کا ذکر ملتا ہے۔ ان دونوں کے بارے میں مرزا صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ "اِس خاندان کے دو بھائی محبوب خاں اور بابا خاں جنہیں تین واسطوں سے امیر کمال الدین سے نسبت تھی، ہمایوں کے ساتھ آئے تھے"۔ یہ نام محبوب خاں نہیں مجنوں خاں ہے۔ غالباً سہوِ کاتب ہے۔ کیونکہ اصل نام مجنوں خاں ہے[۲]۔

۱۔ نعیم اللہ بہرائچی، معمولاتِ مظہریہ، کانپور، ۱۲۸۴ھ ص ۱۱

۲۔ ملاحظہ ہو۔ غلام علی آزاد بلگرامی، سروِ آزاد، ص ۲۳۲ — بندرا ابن راقم، سفینۂ خوش گو، پٹنہ، ۱۹۵۹، ص ۳۰۱۔

جب ہمایوں ایران کے بادشاہ کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کرنے ہندوستان آیا تو مجنوں خاں اور بابا خاں بھی ساتھ آئے تھے۔ تذکرہ ہمایوں و اکبر میں ان امراء کی فہرست دی گئی ہے جو ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ اِس فہرست میں مجنوں خاں کا نام تو ہے لیکن بابا خاں کا نہیں[1]۔ ممکن ہے اس وقت بابا خاں قابلِ ذکر نہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بابا خاں کچھ دن بعد ہندوستان آئے ہوں۔ مرزا صاحب کا سلسلۂ نسب انہیں بابا خاں سے ملتا ہے۔

ہمایوں کی وفات کے وقت مجنوں خان نارنول کے جاگیردار تھے۔ ہمایوں کے انتقال کی خبر سُن کر حاجی خاں نامی ایک امیر نے مجنوں خاں کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ دن بعد صلح ہو گئی۔ اور مجنوں خاں دلّی آ گئے۔ اکبر نے انھیں مانک پور کی جاگیر بخش دی[2]۔ مجنوں خاں نے بہت اہم معرکوں میں حصہ لیا تھا۔ ۹۷۱ ہجری (۱۵۶۳-۱۵۶۴ء) میں جب جون پور کے صوبہ دار علی قلی خاں نے بغاوت کی تو یہ فوج لے کر مقابلے کے لئے گئے تھے، مگر شکست ہوئی اور انھیں فرار ہو کر مانک پور میں پناہ لینی پڑی[3]۔ ۹۷۴ ہجری (۱۵۶۶-۱۵۶۷ء) میں علی قلی خاں کے دوبارہ بغاوت کرنے پر اکبر خود فوج لے کر گیا۔ مجنوں خاں فوج کے دائیں بازو کے سپہ سالار تھے۔ اِس دفعہ شاہی فوج کو فتح ہوئی۔ ۹۷۶ ہجری (۱۵۶۸-۱۵۶۹ء) میں اکبر نے انھیں کالنجر تسخیر کرنے کے لئے بھیجا۔ والی کالنجر راجا رام چندر نے جنگ کیے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔ ۹۸۹ ہجری (۱۵۸۱ء) میں جب شاہی فوج نے بنگال فتح کیا تو گھوڑا گھاٹ کی جاگیر مجنوں خاں اور بابا خاں دونوں کو ملی[4]۔ آئینِ اکبری میں "بزرگانِ جاید

---

۱ - بایزید بیات، تذکرۂ ہمایوں و اکبر، کلکتہ، ۱۹۴۱، ص ۱۸۰۔

۲ - نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں، ماثر الامراء، کلکتہ، ۱۸۸۸ء، جلد ۳، ص ۲۰۹-۲۱۱

۳ - ابوالفضل، اکبر نامہ، کلکتہ، ۱۸۷۹، جلد ۲، ص ۲۵۷

۴ - تذکرہ ہمایوں و اکبر، ص ۳۴۱

دولت" کے تحت مجنوں خاں کا نام سہ ہزاری منصب داروں میں ہے[1]۔

۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) میں مجنوں خاں کا انتقال ہوگیا[2]۔ گھوڑا گھاٹ کی جاگیر مجنوں خاں کے لڑکے جباری خاں کو مل گئی۔ لیکن جاگیر کے عملاً اختیارات باباخاں ہی کے پاس رہے[3]۔ ہندوستان کے قاقشالان کی سرداری باباخاں ہی کو ملی۔ علی قلی خاں کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جس دفعہ اکبر خود گیا تھا تو یہ تیر انداز دستے کے سردار تھے۔ اِس جنگ میں اکبر کو فتح ہوئی۔ بقول ابوالفضل اس فتح میں باباخاں کی بہادری اور دلیری کو بہت دخل تھا۔ ابوالفضل نے ان کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ "مردمعرکہ دیدۂ تجربہ کار" تھے[4]۔ ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) میں جب بنگال پر حملے کے لئے اکبر نے اکیس (۲۱) سرداروں کا انتخاب کیا تو ان میں باباخاں اور مجنوں خاں دونوں کے نام شامل تھے[5]۔

اکبر نے ایک "آئینِ داغ" بنایا۔ جس کی رُو سے تمام جاگیرداروں کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی فوج کے سواروں کو بھیج کر ہر سوار کا حلیہ لکھوائیں۔ اور ہر گھوڑے کے چہرے یا پچھلی ٹانگوں پر ایک داغ لگوائیں[6]۔ اس آئین نے رشوت خوری کا دروازہ کھول دیا۔ کارندے سوار کا حلیہ لکھنے اور گھوڑے پر داغ لگانے کے لیے رشوتیں طلب کرتے۔ باباخاں کو اپنے سوار اور گھوڑے بنگالے کے صوبے دار مظفر خاں کے پاس بھیجنے ہوتے۔ باباخاں سوار بھیجتے تو مظفر خاں کے کارندے رشوت طلب کرتے۔ ایک موقع

۱۔ ماثرالامرا، جلد سوم، ص ۲۱۱۔
۲۔ ماثرالامرا، جلد سوم، ص ۲۱۱۔
۳۔ ایضاً، جلد اول، ص ۳۹۔
۴۔ اکبر نامہ، جلد ۲، ص ۳۹۳۔
۵۔ اکبر نامہ، جلد ۳، ص ۱۰۴۔
۶۔ "آئینِ داغ" کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو:۔ آئینِ اکبری، جلد ۱، ص ص ۱۴۶-۱۴۵۔ دربارِ اکبری، ص ص ۵۷-۵۳۔ اکبر نامہ، جلد ۳، ص ص ۲۹۱-۲۹۰۔

پر بابا خاں نے بتایا کہ میں ستر ہزار روپے رشوت دے چکا ہوں۔ لیکن ابھی تک سو گھوڑے بھی داغے نہیں گئے![1] اس ظلم سے تنگ آکر جب معصوم خاں کابلی اور دوسرے جاگیرداروں نے بغاوت کی تو باباخاں اور مجنوں خاں کے لڑکے جباری خاں بھی اُن کے ساتھ ہوگئے۔

باغیوں نے بنگالے کے صوبے دار منظفر خاں پر کئی بار حملہ کیا لیکن ناکام رہے۔ ایک بار پھر انھوں نے شورش کی اس دفعہ کامیابی ہوئی۔ منظفر خاں مارا گیا۔ اس فتح میں جو مقبوضات ملے انھیں باغیوں نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ اور سب باغی سرداروں نے آپس میں عہدے تقسیم کرلیے۔ اور خود ہی لقب بھی اختیار کرلیے۔ باباخاں نے خانخاناں کا لقب اختیار کیا۔ اور بنگالے کے صوبے دار ہوگئے۔[2] اس دن وہ ایسے بیمار پڑے کہ مرکر ہی اُٹھے۔[3]

کچھ ہی دن بعد اکبر نے باغیوں پر قابو پالیا۔ مجنوں خاں کا لڑکا جباری خاں گرفتار ہوگیا۔ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۴ء) میں جباری خاں کے احساسِ ندامت سے متاثر ہوکر اکبر نے انھیں آزاد کردیا۔[4] اس بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے خوشگو لکھتے ہیں:

"مرزا جان جاں مظہر تخلص، مرزا جان کے لڑکے اور اُن مجنوں خاں قاقشال کی اولاد میں سے ہیں جنھوں نے اکبر شاہی عہد میں بغاوت کی تھی۔ اِسی لیے اس خاندان کے لوگوں کو سرکاری ملازمت میں نہیں رکھا جاتا۔ البتہ اُن

۱۔ مآثر الامرا، جلد ۱، ص ۳۹۱۔

۲۔ نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں "چونکہ اکبر نے اپنے پچیسویں سالِ جلوس میں دینِ اسلام سے انحراف کیا تھا، اِس لیے باباخاں نے بغاوت کی۔" بشاراتِ مظہریہ (قلمی) ۱۶ ب۔ بحوالہ مرزا مظہر جانجاناں اور اُن کا کلام، ص ۲۵۔ بہرائچی کے اس بیان کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوتی۔

۳۔ مآثر الامرا، جلد ۱، ص ص ۳۹۲ - ۳۹۱

۴۔ اکبر نامہ، جلد ۳، ص ۶۵۰

(مرزا صاحب) کے والد مرزا جان عالمگیر بادشاہ کے منصب دار تھے"[1]

خوشگو کے اِس بیان میں کئی غلطیاں ہیں۔ مرزا صاحب مجنوں خاں کی نہیں باباخاں کی اولاد میں سے تھے۔ عہدِ اکبری میں، بغاوت میں حصہ باباخاں نے لیا تھا مجنوں خاں نے نہیں۔ مجنوں خاں کا انتقال تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ خوشگو کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ اِس خاندان پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ ہاں یہ درست ہے کہ ان لوگوں کو اعلیٰ مناصب نہیں ملتے تھے۔ شاہ غلام علی نے لکھا ہے کہ اکبر نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ اس خاندان کے لوگوں کو اعلیٰ مناصب پر فائز نہ کیا جائے۔[2]

خود مرزا صاحب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "خانِ مذکور (باباخاں) کے جرم کی وجہ سے کہ عہدِ اکبری میں انھوں نے بغاوت کی تھی میرے والد" عارِ کم منصبی" میں گرفتار تھے۔[3]

باباخاں اور جباری خاں کے بعد پھر اِس خاندان کے کسی آدمی کا نام تاریخ کے صفحات پر نہیں آتا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خاندان کے لوگوں پر اعلیٰ مناصب بند کر دیے گئے تھے۔

مرزا عبدالسبحان

یہ مرزا صاحب کے دادا اور مرزا محمد امان کے لڑکے تھے۔ نعیم اللہ بہرائچی نے لکھا ہے کہ "اُن کی شادی اکبر بادشاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اور اورنگ زیب کے عہد میں کسی منصب پر فائز تھے"[4] اول تو اکبر بادشاہ کی لڑکی سے مرزا عبدالسبحان کی شادی

۱۔ سفینۂ خوشگو، ص ۳۰۱۔ ۲۔ شاہ غلام علی، مقاماتِ مظہری، دہلی، ۱۳۰۹ھ، ص ۸۷۔
۳۔ کلماتِ طیبات، ص ۱۴۔ ۴۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۵۔

کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ اور دوسرے اورنگ زیب کے منصب داروں میں مرزا عبدالسبحان کا نام نہیں ملتا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے خطوط میں مجنوں خاں اور بابا خاں کا بارہا ذکر کیا ہے۔ لیکن مغلیہ خاندان سے اپنے اس قریبی رشتے کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔ اگر نعیم اللہ بہرائچی کا یہ بیان درست ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ مرزا صاحب کے جدِّ امجد اور والد مغلیہ دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز نہ ہوتے۔ جب تک کچھ اور شہادتیں نہ مل جائیں اس بیان کو درست نہیں ماننا چاہیئے۔

مرزا عبدالسبحان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت نیک بزرگ تھے۔ چشتیہ سلسلے کے ماننے والے تھے۔ بہت خدا ترس، سحر خیز اور تہجّد گزار تھے۔ اور چشتیہ سلسلے میں لوگوں کو مُرید کرتے تھے۔ جتنے سوار اور خدمت گار اُن کے ماتحت تھے۔ سب اُن کے فیضانِ صحبت سے تہجد گزار تھے!

مرزا صاحب کی دادی

شاہ غلام علی کا بیان ہے کہ مرزا صاحب کی دادی نواب[۲] اسد خاں وزیر کی صاحبزادی تھیں[۳]۔ جبکہ نعیم اللہ بہرائچی کا کہنا ہے کہ یہ نواب صاحب کی خالہ زاد بہن تھیں[۴]۔ یہ شیعہ تھیں لیکن شادی کے بعد سُنّی ہوگئی تھیں۔ یہ خاتون اِس پائے کی عالم تھیں کہ عورتوں کو مثنوی

۱۔ مقاماتِ مظہری، ص ۱۴

۲۔ نواب اسد خاں عالمگیری پہلے آختہ بیگی کے ملازم تھے۔ پھر شاہی دربار میں بخشی گری دوم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو ان کا پانصدی منصب تھا۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے وزارت کے عہدے تک پہنچ گئے۔ مآثر الامرا، جلد ۱، ص ۳۱۱۔

۳۔ مقاماتِ مظہریہ، ص ۱۵۔ ۴۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۵۔

مولانا روم پڑھاتی تھیں۔

مرزا جان

مرزا صاحب کے والد کا نام مرزا جان تھا۔ مرزا جان شاہی ملازمت میں تھے۔ لیکن کسی اعلیٰ منصب پر فائز نہیں تھے۔ کیونکہ عہدِ اورنگ زیب کی کسی تاریخ میں ان کا نام نہیں ملتا۔ نعیم اللہ بہرائچی[1] اور خلیل السہرندی[2] دونوں نے لکھا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے لشکر میں ملازم تھے۔ گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ مرزا جان عہدۂ قضا پر فائز تھے۔[3]

مرزا جان نے کسی بات پر ملازمت ترک کر دی۔ ترکِ ملازمت کی تفصیل نعیم اللہ بہرائچی نے اِن الفاظ میں بیان کی ہے۔

"جس زمانے میں اورنگ زیب ممالکِ دکن کی تسخیر کی طرف متوجہ تھا، صوبیدار ارکاٹ نے بغاوت کی۔ بادشاہ بہت پریشان ہوا۔ چونکہ صوبے دار ارکاٹ اور مرزا جان میں بڑی محبت اور یگانگت تھی، اِس لیے ارکانِ دولت نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ مرزا جان کو صوبیدار ارکاٹ کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ اُسے سمجھا کر بادشاہ کی اطاعت پر راضی کریں۔ بادشاہ نے مرزا جان کو اس کام پر متعین کیا۔ انھوں نے صوبیدار کو بادشاہ کی اطاعت پر آمادہ کر لیا۔ اور اس کی طرف سے ایک خطیر رقم بطریقِ پیش کش اور بہت سے تحائف بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ جو تحائف، جواہر وغیرہ خود انھیں مِلے تھے ان میں سے کچھ نہ لیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اُن سے کہا کہ اگر تمھاری کوئی خواہش ہو تو کہو وہ پوری کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک مدت سے اپنے منصب میں ترقی کا اُمیدوار

١۔ مقاماتِ مظہری، ص ۱۵

٢۔ خلیل السہرندی، تراجم المشائخ، بحوالہ مرزا مظہر جانجاں ص ۲۸۔

٣۔ گارساں دتاسی، تاریخ ادبیاتِ ہندوستانی، جلد ۲، ص ۲۹۷۔

ہوں، بادشاہ نے کہاکہ اگر اس کے علاوہ کچھ چاہتے ہو تو کہو۔ انھوں نے کہاکہ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں چاہتا۔ بادشاہ کو غصّہ آگیا۔ اس نے کہاکہ تمہیں اپنے اجداد کی نمک حرامی یاد نہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ نمک حرامی اور جانفشانی دونوں یاد ہیں۔ ان ہی لوگوں کی جانفشانی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان کا تخت آپ کے تصرّف میں ہے۔ بادشاہ نے کہاکہ خلد مکان نے مجھے چند وصیتیں کی تھیں۔ ان میں ایک یہ تھی کہ تمہارے خاندان کے کسی فرد کو اعلیٰ منصب نہ دیا جائے۔ مرزا جان نے کہا تو پھر میں بھی آپ کی خدمت سے دست بردار ہوتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور اکبرآباد آکر ترکِ دنیا کرکے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔"[۱]

نعیم اللہ بہرائچی کے اس بیان میں دو غلطیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ "خلد مکان" سے مُراد شاہجہاں بادشاہ سے ہے۔ حالانکہ خود اورنگ زیب کو "خلد مکان" کہا جاتا ہے۔ خیر یہ کوئی بڑی غلطی نہیں۔ ممکن ہے نعیم اللہ بہرائچی کو سہو ہوگیا ہو۔ لیکن دوسری غلطی تاریخی ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ارکاٹ صوبہ نہیں تھا۔ اِس لیے وہاں کے صوبے دار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورا واقعہ من گھڑت ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

مرزا جان خوبانِ روزگار میں تھے۔ بقول نعیم اللہ بہرائچی سلاطین و امرا اُن کے عادات و اطوار کو سند و حجّت مانتے تھے۔ مرزا جان جملہ علوم و فنون کے ماہر تھے۔ کُشتی اور تیراندازی دو فن ایسے تھے جن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔[۲] ایک اور معتبر ذریعہ سے مرزا جان کے علم و فضل کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز فرماتے تھے کہ

۱۔ بشاراتِ مظہریہ (قلمی) ورق ۱۱۸۔ بحوالہ مرزا مظہر جانجاناں اور اُن کا کلام، ص ص ۲۹ - ۲۸۔
۲۔ بشاراتِ مظہریہ، ق ۱۸۔ بحوالہ مرزا مظہر جانجاناں، ص ۲۷۔

مرزا محمد زاہد کہا کرتے تھے کہ "تقریرِ مرزا جان، جانِ من است"۔[1]

مرزا جان حضرت شاہ عبدالرحمٰن قادری کے مُرید تھے[2]۔ انھیں شعروشاعری کا بھی شوق تھا۔ جانی تخلص تھا۔ کسی تذکرے میں اُن کا ذکر نہیں ملتا۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برائے نام ہی شعر کہتے تھے۔ مرزا صاحب نے خریطۂ جواہر کے نام سے فارسی شعرا کا ایک انتخاب کیا تھا۔ اس میں مرزا جان کے یہ دو اشعار بھی شامل ہیں ؎

نے صبر و نے قرار و نے امید وصلِ یار
چوں من کسے بکام دل روزگار نیست
خوں شد دل خدنگ تو تا از تو دردمند
آں نیز رفتہ رفتہ بہ پہلوئے ما نشست

مرزا جان نے جب ملازمت ترک کی تو تمام اسبابِ جاہ و حشم اور لوازمات فقیروں میں تقسیم کر دیا۔ اپنی صاحبزادی (یعنی مرزا صاحب کی بہن) کی شادی کے لئے پچیس ہزار روپیہ بچا کر رکھ لیا۔ ایک دفعہ انھیں معلوم ہوا کہ اُن کے کسی دوست کو روپیوں کی ضرورت ہے، یہ روپے بھی اُسے دے دیے۔

اُن کے قناعت و توکّل کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ انھوں نے گھر میں کدو کی بیل لگا لی۔ لونڈی نے کہا۔ آپ نے یہ بیل تو لگا لی لیکن ایسا نہ ہو کہ فاقے کے وقت جب کچھ گھر میں نہ ہو تو آپ اُس کے برگ و بار کھائیں اور یہ شیوۂ توکل و قناعت کے خلاف ہے۔ مرزا جان نے کنیز کی اِس بات کو تعلیمِ الٰہی سمجھ کر بیل کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ حیرت یہ ہے کہ اس عہد کے صوفیا کے

۱۔ مناظر احسن گیلانی، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، حیدرآباد، ۱۹۴۶ء، ص ۱۸۴۔

۲۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۱

تذکروں میں کہیں اُن کا نام نہیں آتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفی کی حیثیت سے اُن کی کچھ زیادہ شہرت نہیں تھی۔ ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۷ء-۱۷۱۸ء) میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ ۱

مرزا صاحب کی والدہ

مرزا صاحب کی والدہ کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ بیجاپور کے شاہی خاندان سے تھیں۔ اور غالباً مرزا جان کے قیامِ دکن کے دَوران اُن کی شادی ہوئی تھی۔ نعیم اللہ بہرائچی نے اُن کے بارے میں لکھا ہے کہ بہت نیک، پارسا اور عبادت گزار تھیں۔ اور جُود و سخا میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ۲

مرزا صاحب کی ہمشیرہ

مرزا جان کی شاید صرف دو ہی اولادیں تھیں۔ مرزا مظہر اور اُن کی ہمشیرہ۔ جب مرزا جان نے ترکِ دنیا کیا ہے تو اپنی صاحبزادی کی شادی کے لئے پچیس ہزار روپے بچا کر رکھے تھے۔ مرزا مظہر کو اُن سے بہت زیادہ محبّت تھی۔ بچپن میں مرزا صاحب نے اپنی بہن سے یہ عہد کیا تھا کہ اُن میں پہلے کوئی بھی مَرے دوسرا خودکشی کرے گا۔ اتفاق سے بہن کی وفات پہلے ہوئی۔ وفات کے وقت بہن نے بچپن کا وعدہ یاد دلایا۔ مرزا صاحب نے کہا کہ میں اپنا وعدہ پورا کرنے کو تیار ہوں۔ ابھی ایک کٹار میں کام تمام ہو جائے گا۔ لیکن اِس طرح میں تمہارا ہم سفر نہیں ہو سکتا۔ تم شہیدوں کے قافلے میں جنّت کی طرف جاؤ گی اور میں حرام موت مرنے کی وجہ سے

۱۔ مرزا جان کے حالات، مقاماتِ مظہری ص ص ۱۶ - ۱۵ اور معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۵ سے لیے گئے۔

۲۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۴

دوسرے راستے۔

مرزا صاحب نے احمد شاہ بادشاہ کے وزیر نواب انتظام الدولہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے :-

"فقیر کے ہمشیر زادے ہیں۔ اگرچہ کوئی کمال نہیں رکھتے لیکن آدمیت سے خالی نہیں ہیں۔ اقتضائے زمانہ سے پریشان ہیں۔ خصوصًا ان میں سے ایک تو اضطراری کیفیت میں گرفتار ہے ..... جس برخوردار کو جاگیر سرکار کی بہت تمنّا ہے اسے کل آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔"[1]

اِس خط میں جن ہمشیر زادوں کا ذکر ہے وہ غالبًا انہی بہن کے صاحبزادے ہیں۔

مرزا صاحب کی ولادت

عنایت اللہ فتوت[2]، احمد علی سندیلوی[3] اور فتح علی حسینی گردیزی[4] نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی ولادت اکبر آباد میں ہوئی۔ لیکن مرزا صاحب کے سوانح نگار نعیم اللہ بہرائچی کا بیان مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب مرزا جان ملازمت ترک کر کے دکن سے اکبر آباد جا رہے تھے تو راستے میں انھوں نے حدودِ مالوا میں واقع کالا باغ میں قیام کیا۔ یہیں ۱۱ رمضان المبارک، جمعہ کی رات کو مرزا صاحب کی ولادت ہوئی[5]۔ اگرچہ کسی اور ذریعہ سے مولوی نعیم اللہ بہرائچی کے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ لیکن جس طرح

۱۔ کلماتِ طیبات، ص ۵۷

۲۔ عنایت اللہ فتوت، ریاض حسنی (قلمی) سینٹرل ریکارڈ آفس حیدر آباد، ص ۱۸۴۔

۳۔ احمد علی سندیلوی مخزن الغرائب (قلمی) دار المصنّفین اعظم گڑھ، ورق ۲۰۴ ب۔

۴۔ فتح علی حسینی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویان، اورنگ آباد، ۱۹۳۳، ص ۱۳۱۔

۵۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۴۔

انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا بیان درست ہے۔

تاریخ ولادت

جائے ولادت کی طرح مرزا صاحب کے سنہ ولادت میں بھی اختلاف ہے۔ مختلف تذکروں اور خود مرزا صاحب کی تحریروں میں سنہ ولادت ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۸ء) اور ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) کے درمیان ہے۔ مرزا صاحب نے جب غلام علی آزاد بلگرامی کی فرمائش پر "سروآزاد" کے لئے اپنے حالات لکھ کر بھیجے تو اپنے سنہ ولادت کے بارے میں لکھا۔ "درعشرہ اولی مایۃ ثانیہ بعد الف ولادتش اتفاق افتاد۔"[1] اس بیان کے مطابق مرزا صاحب کا سنہ ولادت ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۸ء۔ ۱۶۹۹ء) قرار پاتا ہے۔

۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء) میں مرزا صاحب فارسی دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "امروز کہ ہزار صد و ہفتاد و عمر بہ شصت رسیدہ۔"[2] گویا ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء۔ ۱۷۵۷ء) میں اُن کی عمر ساٹھ سال تھی، جس کا مطلب ہے کہ وہ ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۸ء۔ ۱۶۹۹ء) میں پیدا ہوئے تھے۔

مرزا صاحب نے ایک مرید کو اپنا سنہ ولادت ۱۱۱۳ھ (۱۷۰۱ء۔ ۱۷۰۲ء) لکھا ہے۔[3] حسین علی خاں عاشقی[4] اور خیراتی لال بے جگر[5] نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب آخر شب جمعہ ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۸ء۔ ۱۶۹۹ء) کو پیدا ہوئے۔ نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں۔" (ولادت) در ہزار و صد و یازدہ ہجر بیست و بقولے سیزدہ۔ روایت اولیٰ مطابق

۱۔ سروآزاد، ص ۲۳۲۔ ۲۔ دیوانِ فارسی، ص ۴۔

۳۔ کلماتِ طیبات، ص ۱۳، مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، ص ۶۰۔

۴۔ حسین علی خاں عاشقی، نشترِ عشق (قلمی)، رضا لائبریری رام پور، ص ۱۲۵۴۔

۵۔ خیراتی لال بے جگر، تذکرہ بے جگر (قلمی) فوٹو سٹیٹ مملوکہ مالک رام صاحب، ورق ۱۶۲ب۔

حسابِ عقودِ رشتہ سالگرہ؎۱ شاہ غلام علی کا بیان ہے "(ولادت) در سنہ ہزار و صد و یازدہ یا سیزدہ یازدہم رمضان المبارک وقت فجر روز جمعہ بود"؎۲ لچھمی نرائن شفیق نے میر محمد افضل الہ آبادی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "فقیر بہ مرزا جانجاناں مظہر سلمہ اللہ تعالیٰ نوشتم کہ سالِ ولادت ثابت کردہ باید نوشت مرزا در جواب قلمی نمود۔ دوازدھم ربیع الاول سنہ ہزار و صد و پنج"؎۳ اب گویا ۱۱۰۵ھ (۱۶۹۳ء-۱۶۹۴ء) قرار پاتی ہے۔

نعیم اللہ بہرائچی نے ولادت کی تاریخیں بھی پیش کی ہیں

۱۔ تولّد صاحبِ شرع

۲۔ طلوع شمس الملّت والدین؎۴

اِن دونوں تاریخوں سے ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) برآمد ہوتا ہے۔ لیکن یہ دونوں تاریخیں بہت بعد میں کہی گئی ہیں۔

لچھمی نرائن شفیق کا بیان تو کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ لیکن نعیم اللہ بہرائچی اور شاہ غلام علی کے بیان میں اہم بات یہ ہے کہ دونوں نے تاریخ اور دن یعنی جمعہ گیارہ رمضان المبارک بتایا ہے۔ سنہ ولادت میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن عام طور سے دن اور تاریخ میں نہیں ہوتا۔ اگر ہم تسلیم کرلیں کہ مرزا صاحب ۱۱ رمضان کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے تھے تو ۱۱۱۳ھ (۱۷۰۱ء-۱۷۰۲ء) میں ۱۱ رمضان کو جمعرات کا، اور ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰-۱۷۰۱ء) میں اس تاریخ کو ہفتے کا اور ۱۱۱۱ھ میں منگل کا دن پڑتا ہے۔ ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۸ء-۱۶۹۹ء) وہ سال ہے جب ۱۱ رمضان کو جمعہ کا دن تھا اس لئے یہی دُرست معلوم ہوتا ہے۔ گویا مرزا صاحب ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۹ء) میں گیارہ

۱۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۶۔ ۲۔ مقاماتِ مظہری، ص ۱۶

۳۔ لچھمی نراین شفیق، گُلِ رعنا (قلمی) رضا لائبریری رام پور۔

۴۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۶۔

رمضان المبارک کو بقول نعیم اللہ جمعہ کی رات کو اور بقول شاہ غلام علی جمعہ کی صبح کو پیدا ہوئے۔

مرزا صاحب کا نام اور تخلّص

نعیم اللہ بہرائچی نے مرزا صاحب کا پورا نام اس طرح لکھا ہے۔

"جانِ[1] جاں نام، مظہر تخلص، شمس الدین حبیب اللہ لقب۔"[2]

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ جب عالمگیر کو مرزا صاحب کی ولادت کی خبر ہوئی تو "عالم گیر نے کہا بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے۔ باپ مرزا جان ہے۔ اس کا نام ہم نے جانِ جاں رکھا۔ پھر اگرچہ باپ نے شمس الدین نام رکھا مگر عالم گیری نام کے سامنے نہ چمکا۔[3] مولانا آزاد کو سہو ہوا۔ کیونکہ اس سلسلے میں ان کی معمولات کا مآخذ معمولاتِ مظہریہ ہے۔ اور اس کتاب میں واضح الفاظ میں لکھا گیا ہے کہ شمس الدین حبیب اللہ مرزا صاحب کا لقب تھا۔[4] نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں کہ جب اورنگ زیب نے مرزا صاحب کی ولادت کی خبر سنی تو کہا "پسر جانِ پدر میباشد، چوں نام والدش مرزا جان ست نام پسرش جانِ جاں مقرر کردیم۔"[5] مصحفی کے بیان سے اس کی

۱۔ مرزا صاحب نے ایک فارسی شعر میں اپنے نام کی توجیہہ بہت خوبصورت انداز میں کی ہے ؎

زتاثیر محبّت در دلش کردیم جا مظہر
بجا باشد اگر خوانند یاراں جانِ جاں مارا

۲۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۶

۳۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات، لاہور (بار یازدہم)، ص ۱۳۸

۴۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۶

۵۔ ایضاً، ص ۶

تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن مرزا صاحب نے اپنے نام کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے کہا کہ "میرے والد کا نام مرزا جان تھا اور میری ولادت خُلد مکان (اورنگ زیب) کے آخری زمانے میں ہوئی تھی۔ جب انھیں خبر ملی تو انھوں نے فرمایا کہ اِس بچّے کا نام جانِ جاں رکھا جائے۔"[۱]

مرزا صاحب کا نام جانِ جاں سے بگڑ کر جانِ جاناں کب ہوا یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ درگاہ قلی خاں جو ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۹ء) میں دلّی آئے تھے، مرزا صاحب کا نام مرزا جانِ جاناں لکھتے ہیں۔[۲] تقریباً ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء) سنہ تالیف مجمع النفایس) میں لکھتے ہیں کہ "اُن کے والد کا نام محمد جان تھا۔ اس لئے (مرزا صاحب کا نام) جان جاں رکھا گیا۔ اب جانجاناں کے نام سے مشہور ہیں۔"[۳]

آزاد بلگرامی نے تقریباً ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) (سنہ تالیف سروِ آزاد) میں مرزا صاحب کا نام مرزا جانِ[۴] جاں لکھا ہے لیکن یہ بھی بتایا ہے کہ "عوام کی زبان پر اُن کا نام جانِ جاناں جاری ہو گیا ہے۔"[۵] ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱ء) میں خواجہ حمید اورنگ آبادی[۶] نے اور ۱۱۶۶ ہجری (۱۷۵۲ء) میں فتح علی حسینی گردیزی نے بغیر کسی تبصرہ کے اُن کا نام مرزا جانِ جاناں لکھا ہے۔

۱۔ عقدِ ثریّا، ص ۵۵

۲۔ جانِ آرزو، مجمع النفایس (قلمی) رضا لائبریری، رام پور، جلد ۲، ص ۸۸

۳۔ درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، حیدرآباد دکن، ص ۴۱

۴۔ آزاد بلگرامی مرزا صاحب کے نام اور تخلّص کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کا نام اور تخلّص ترجمانِ اسرارِ قیومی مولانا رومی نے عنایت فرمایا ہے۔ مثنوی کے دفترِ ششم میں پانچ سو سال پہلے انھوں نے فرمایا تھا ؎

جانِ اوّل مظہرِ درگاہ شد　　جانِ جاں خود مظہرِ اللہ شد　(سروِ آزاد ص ۲۳۱)

۵۔ سروِ آزاد، ص ۲۳۱۔　۶۔ خواجہ حمید اورنگ آبادی، گلشنِ گفتار، حیدرآباد: ۱۳۲۹ف، ص ۲۳

۷۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۱۳۱۔

میر تقی میرؔ کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ "خواص" ایسے بھی تھے جنھوں نے یہ نام قبول نہیں کیا تھا۔ محمد حسین کلیمؔ کا ایک شعر ہے ؎

بقیس کے شعروں پر ہیں بدگماں بعضے کہ اس کے نہیں
غلط ہے ہم نے پوچھا ہے گا جانِ جاناں کو

میرؔ اس شعر پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "نام مرزا جان جان ہے اور شاعر نے جانِ جاناں باندھا ہے۔ چونکہ اکثر عوام غلطی سے مرزا کو جانجاناں کہتے ہیں۔ اس (غلط نام کی) شہرت کی وجہ سے شاعرِ مذکور نے جانجاناں موزوں کر دیا ہے۔ اگرچہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ہماری گفتگو خواص سے ہے۔"[۱]

میر صاحب کا اعتراض برائے اعتراض ہے۔ کیونکہ اس نام کو اتنی شہرت ہوئی کہ خود مرزا صاحب ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء) (سنہ ترتیب دیوانِ فارسی) میں فارسی دیوان میں اپنا نام جانجاناں ہی لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام خطوط میں انھوں نے اپنا نام جانجاناں[۲] ہی لکھا ہے۔ اور دیوانِ فارسی اور خطوط دونوں ہی میں مرزا صاحب کی گفتگو خواص سے تھی۔

۱۔ میر تقی میر، نکات الشعرا، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء، ص ۸۳

۲۔ عہدِ امجد علی شاہ میں کسی نے "حدایق الشعرا" نام سے ایک تذکرہ تالیف کیا تھا۔ تذکرے پر مولف کا نام نہیں ہے۔ مولف نے مرزا صاحب کے ترجمے میں جو غلط بیانیاں کی ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں۔ لکھتا ہے "مرزا عمدۃ الملک نواب امیر خاں جانجاناں المشتہر بہ مرزا جان جاناں۔ مولف تذکرہ تالیف الاشعار و مثنوی عشق و حسن۔ مصاحب و ندیم محمد شاہ۔ پہلے مظہر تخلص تھا۔ مرزا جانِ جاناں کا خطاب ملا تو جانجاناں تخلص بھی ہوا۔ اواخر عہد محمد شاہ میں ایک "ناصبی" کے ہاتھ مقتول ہوئے۔ سالِ وفات ۱۱۵۱ ہجری "آہ مظہر" سے معلوم ہوتا ہے۔" یہ تذکرہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں موجود ہے۔ بحوالہ قاضی عبدالودود، شاعر خاص نمبر، سنہ ۱۹۵۹ء، ص ۳۸۔

تخلّص

مرزا صاحب کے تخلّص "مظہرؔ" کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ دہلی میں فارسی کے ایک شاعر مرزا غلام علی تھے۔ اُن کا تخلّص بھی مظہرؔ تھا۔ جب مرزا صاحب مظہرؔ" تخلّص اختیار کیا تو وہ مانع آئے۔ سیّد حسین علی ضیارؔ لکھتے ہیں:

مرزا غلام علی می گفت کہ تخلص من متقدم است کہ من عشرہ ثامنہ عمر را در نوشتہ ام ولے در عشرہ خامسہ قدم گذاشتہ۔ مرزا جانجاناں می فرمود کہ کہ تخلص من اناشارہ مولانائے روم قدس سرہ است۔ جائیکہ فرمودہ اند

جانِ جاں خود مظہر اللہ شد "۱

بھگوان داس ہندی نے اس واقعہ کو ذرا مختلف انداز میں لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں، جب دونوں میں تکرار ہوئی تو" آخر قرار پایا کہ مثنوی مولوی معنوی سے فال نکالی جائے۔ چنانچہ شاہ غلام علی نے فال کے طور پر مثنوی کو کھولا اور یہ شعر نکلا ؎

جانِ اوّل مظہر درگاہ شد

جانِ جاں خود مظہر اللہ شد "۲

تعلیم و تربیت

مرزا صاحب کے والد نے بچپن ہی سے اُن کی تعلیم و تربیت کا بہت اہتمام کیا تھا۔ مختلف فنون حاصل کرنے کے لیے تقسیمِ اوقات کی تاکید کرتے تھے۔ فرماتے تھے

۱۔ سیّد حسین علی ضیارؔ، روزِ روشن، بھوپال، ۱۲۹۷ء ص ۱۰۳، شاہ محمد حمزہ نے فص الکلمات (قلمی) میں بھی یہی واقعہ بیان کیا ہے۔

۲۔ بھگوان داس ہندی، سفینۂ ہندی (قلمی) خدا بخش لائبریری پٹنہ، ص ۱۸۷

کہ زندگی اور وقت کا بدل نہیں۔[1] مرزا جان نے مرتے ہوئے اپنے عزیز بیٹے کو وصیت کی تھی کہ کسبِ کمال میں اپنا وقت صرف کرنا۔ غیر ضروری اشتغال میں اپنی زندگی خراب نہ کرنا۔[2]

مرزا صاحب بہت کم عمر تھے جب والد نے اُن کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مرزا صاحب نے رسایلِ فارسی محاورہ اپنے والد سے پڑھے تھے۔ قرآن شریف قاری عبدالرسول سے پڑھا۔ علمِ تجوید اور قرأت کی سند بھی انھیں سے حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد حدیث و تفسیر کا علم حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے حاصل کیا۔

مرزا صاحب کے اکثر معاصرین نے اُن کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے۔ عنایت اللہ فتوت لکھتے ہیں "اکثر اوقاتِ گرامی حدیث کے مطالعے میں صرف کرتے ہیں اور بزرگوں کی سیر و تواریخ سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں۔"[3] احمد علی سندیلوی کا بیان ہے کہ "بچپن ہی میں صرف و نحو اور معقول و حدیث و تفسیر و عروض و قافیہ، تلخیص المفتاح کا کچھ حصّہ پڑھ لیا تھا اور شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔"[4] قیام الدین قائم لکھتے ہیں "عالم و عامل، عارف و کامل، اربابِ تحقیق کے سر آمد اور اہلِ تدقیق کے پیش رو ہیں۔"[5] گردیزی اُن کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "علمِ فقہ اور حدیث کے عالم ہیں اور سیر و تواریخ کی مہارت رکھتے ہیں۔"[6] اُن کے فہم و ادراک کے متعلق خان آرزو لکھتے ہیں:

"در دقتِ فہم و ذکائے طبع یکتائے لیل و نہار بلکہ بے مثل روزگار است۔ جدتِ طبیعت و جودت قریحہ (کذا) بمرتبہ دارد کہ مصداق ایں مصرع است
کہ سخن نگفتہ باشی بہ سخن رسیدہ باشد"[7]

---

۱ و ۲ مقاماتِ مظہری، ص ۱۵۔ ۳۔ ریاضِ حسنی (قلمی)، ص ۱۸۵۔ ۴۔ مخزن الغرائب (قلمی)۔
۵۔ محمد قیام الدین قائم، مخزنِ نکات، اورنگ آباد، ۱۹۲۹ ص ۳۴۔
۶۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۱۶۱۔ ۷۔ مجمع النفائس (قلمی) جلد ۲، ص ۸۸

اشرف علی خاں کہتے ہیں :

"در دقّتِ فہم و ذکا، طبع و سلاستِ گفتگو و فصاحت و کلام و خوش تقریرے
یکتائے لیل و نہار و بے مثل روزگار آید۔" ۱

محمد حسین آزاد نے مرزا مظہر کی تصویر بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ اُنھوں نے مرزا صاحب پر بعض بیہودہ اور بے بنیاد الزام بھی لگائے ہیں۔ مرزا صاحب کے علم و فضل کے بارے میں آزاد نے جو کچھ کہا ہے وہ کسی اور تذکرہ نگار نے نہیں کہا۔ آزاد کہتے ہیں :

"مرزا صاحب کی تحصیل عالمانہ نہ تھی۔ مگر علمِ حدیث باا صول پڑھا تھا۔" ۲

حالانکہ مرزا صاحب نے کافی عرصے تک طالب علموں کو علومِ ظاہری کا درس دیا تھا۔ شاہ غلام علی لکھتے ہیں کہ "مدّت تک طالب علموں کو علمِ ظاہری کا درس دیا۔ آخر جب نسبتِ باطنی نے غلبہ کیا تو شغلِ کتاب متروک کر دیا۔" ۳

مرزا جان نے اپنے اکلوتے بیٹے کو صرف علومِ متعارفہ تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ آدابِ شاہی فنونِ سپہ گری اور صنایع ہُنروری بھی سکھائے تھے تاکہ اگر بڑے ہو کر امیر بنے تو ہنرمندوں کی قدر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا صاحب امورِ سلطنت سے بھی بہرہ مند تھے اور اپنے عہد کے صاحبِ اقتدار طبقے کو مشورے دیتے تھے۔ مرزا صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "خدا نے ہمیں عقلِ کامل اور اصابتِ رائے بلیغ عطا فرمائی ہے۔ امورِ سلطنت کی تدبیر اور انتظامِ مملکت کے سلسلے میں جیسا جس کے لئے مناسب ہوتا ہے، بتا دیتے ہیں۔ اِس لیے امرائے وقت اپنے معاملات میں ہم سے صلاح و مشورہ لیتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔" ۴ مرزا مظہر جانجاں کے خطوط میں مرزا صاحب کے

۱۔ اشرف علی خاں، تذکرہ الشعرا (قلمی) رضا لائبریری رام پور، ص ۶۹۳
۲۔ آبِ حیات، ص ۱۴۰ ۳۔ مقاماتِ مظہری، ص ۲۹
۴۔ مقاماتِ مظہری، ص ۳۸

وہ خطوط بھی شامل ہیں جو انھوں نے انتظام الدولہ اور نواب عماد الملک کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط سے مرزا صاحب کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ نواب عماد الملک کے نام ایک خط میں مرزا صاحب لکھتے ہیں: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے بعض سردار تم سے خوش ہیں اور بعض ناخوش۔ یہ امر معہود کا ظہور رہے۔ ضرورت پڑنے پر ان لوگوں کو اپنی طرف راغب کرکے کام نکال لینا چاہیئے۔ حریفوں سے مصالحت کرکے اپنا نقشِ مراد حاصل کرنا چاہیئے۔ اور جو باتیں تم نے لکھ کر بھیجی ہیں ان کو راز رکھنا چاہیئے۔ ورنہ مخالفوں کی طبیعت پر بہت گراں گزریں گی۔"[۱] قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں کہ۔ "اکثر اہلِ دول ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے۔ (مرزا صاحب) کبھی کسی سے کوئی غرض نہ رکھتے۔"[۲]

مرزا صاحب نے اسلحہ کے استعمال میں بھی پوری مہارت حاصل کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ "اسلحہ کے استعمال میں مجھے ایسی مہارت ہے کہ اگر بیس آدمی تلواروں سے مجھ پر حملہ کریں اور میرے ہاتھ میں صرف لاٹھی ہو تو کوئی میرا بال بیکا نہیں کرسکتا۔"[۳]

شاہ غلام علی نے مرزا صاحب کی اسلحہ کے استعمال میں مہارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دفعہ مرزا صاحب مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا تھا۔ سلام پھیرتے وقت اچانک بجلی چمکی اور اس کی روشنی میں مرزا صاحب نے دیکھا کہ ایک شخص اُن پر خنجر سے حملہ کررہا ہے۔ اُنھوں نے لپک کر اس کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا اور اُسے واپس کردیا۔ اس نے پھر وار کیا۔ اس طرح اُس نے سات بار وار کیا اور مرزا صاحب نے ہر بار خنجر چھین لیا اور واپس کردیا۔ یہاں تک کہ وہ مرزا صاحب کے قدموں میں گر پڑا۔[۴]

۱۔ خط بنام نواب عماد الملک، خط نمبر ۶۲
۲۔ قدرت اللہ شوق، تکملۃ الشعرا (قلمی)، رضا لائبریری رام پور، ص ۵۶۲
۳،۴۔ مقاماتِ مظہری، ص ۱۷

مرزا صاحب کا بیان ہے کہ "میں نے چودہ سال باک اور پٹے کے فن میں مہارت حاصل کی ہے۔ اگرچہ یہ فن فقیروں اور درویشوں کے شایانِ شان نہیں لیکن اگر اسے حفاظتِ نفس کی خاطر حاصل کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ اس فن کی بدولت میں ہمیشہ گزند سے محفوظ رہا، مگر میں نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا۔" ۱

ایک دفعہ مرزا صاحب گھوڑے پر سوار بازار سے گزر رہے تھے۔ سامنے سے ایک مست ہاتھی آ رہا تھا۔ فیل بان چلّایا کہ ہٹ جاؤ۔ مرزا صاحب نہیں ہٹے۔ ہاتھی نے انھیں اپنی سُونڈ پر اُٹھا لیا۔ مرزا صاحب نے خنجر سے اُس کی سونڈ پر وار کیا ہاتھی نے گھبرا کر انھیں زمین پر پھینک دیا اور مرزا صاحب بچ گئے۔ ۲

مرزا صاحب نے ایک خط میں جنگ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں وہ شریک تھے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ میں جنگ میں شریک تھا۔ جب جنگ شباب پر تھی اور چاروں طرف سے تیروں کی بوچھاڑ اور نیزوں کے وار ہو رہے تھے تو میرے برابر ہاتھی پر سوار ایک سردار تھا وہ سمجھا کہ مرزا صاحب ڈر گئے ہیں۔ مجھے جب اس کا احساس ہوا تو میں نے فوراً ایک غزل موزوں کر کے سُنائی۔ سردار ایسے خطرناک وقت میں اتنے ہوش و حواس دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ۳ نعیم اللہ بہرائچی نے اس سردار کا نام شیخ سرفراز علی خاں بتایا ہے اور اس غزل کا یہ مطلع نقل کیا ہے ؎

ایں فتح را بنام نگاہت نوشتہ ایم

دل را ہلاک چشم سیاہت نوشتہ ایم ۴

مرزا صاحب نے مختلف فنون میں مہارت حاصل کی تھی۔ بقول شاہ غلام علی

۱۔ بشاراتِ مظہریہ، ورق ۶ ب بحوالہ مرزا مظہر جانجاناں اور اُن کا کلام، ص ۳۷

۲۔ مقاماتِ مظہری، ص ۳۸ ۳۔ مقاماتِ مظہری، ص ۱۷

۴۔ بشاراتِ مظہریہ (قلمی)، ورق ۷ ب بحوالہ مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا اردو کلام۔

انھیں کپڑا کاٹنے میں بڑی مہارت تھی - خاص طور سے شلوار پچاس طریقوں سے قطع کر سکتے تھے - [1]

علمِ موسیقی میں بھی انھیں مہارت تھی - اور بقول نعیم اللہ بہرائچی اس فن کے ماہر اصلاح کے لئے حاضرِ خدمت ہوتے تھے - [2]

شاہ غلام علی لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کو ہر فن میں مہارت حاصل تھی - ہر پیشے کے ہنرور اپنے ہنر میں اُن سے اصلاح لیتے تھے - جو کوئی بھی اُن سے ملاقات کرتا اپنے فن میں اُن کی اُستادی کا اقرار کرتا - [3] قدرت اللہ گوپاموی نے لکھا ہے کہ ہر فن کے شائق کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچاتے تھے - [4]

علمِ باطنی

مرزا صاحب نے ایک ایسے ماحول میں ہوش سنبھالا جس میں ظاہر سے زیادہ باطن پر زور تھا - جس میں مادّی عیش و عشرت اور جاہ و منصب پر صبر و قناعت، تسلیم و رضا، خود اعتمادی اور بلند کرداری کو ترجیح حاصل تھی - مرزا صاحب کے والد نے اُن کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی تھی کہ وہ امیری اختیار کرتے یا درویشی، دونوں ہی صورتوں میں انھیں تمام ضروری علوم و فنون پر قدرت حاصل تھی - اگرچہ والد کی خواہش یہی تھی کہ مرزا صاحب فقر و درویشی کا راستہ اختیار کریں - اسی لیے وہ مرزا صاحب کو اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالرحمٰن قادری کے پاس بھی لے جاتے تھے - اگرچہ والد کی وفات تک مرزا صاحب کا تصوف کی طرف خاص رجحان نہیں تھا - لیکن بچپن ہی سے اتباعِ کتاب و سنّت میں وہ بہت

۱- مقاماتِ مظہری، ص ۱۷ ۲- بشاراتِ مظہریہ (قلمی) ورق ۲۳ ب

۳- مقاماتِ مظہری، ص ۱۷

۴- قدرت اللہ گوپاموی، نتائج الافکار، بمبئی، ۱۳۳۶ھ، ص ۶۷۵

سخت تھے۔ ایک دفعہ وہ اپنے والد کے ساتھ شاہ عبدالرحمٰن قادری کی خدمت میں حاضر تھے۔ اتفاق سے سکر وسماع کی حالت میں شاہ صاحب عصر اور مغرب کی نماز نہیں پڑھ سکے۔ مرزا صاحب نے یہ حالت دیکھ کر دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر والد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو کہا تو وہ انکار کر دیں گے۔ مگر خیریت گزری والد نے کچھ کہا نہیں۔

مرزا صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ والد کا انتقال ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں ہوا... اور میں سولہ[1] سال کی عمر میں یتیم ہو گیا..... بیس سال کی عمر میں کمر ہمت باندھ کر دنیا سے ہاتھ اٹھا لیا۔[2]

مرزا صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے والد کی وفات کے بعد چار سال طلبِ دنیا میں گزارے۔[3] اسی مدت میں مرزا صاحب کے خیر خواہوں نے کوشش کی کہ شاہی دربار میں اُن کا موروثی منصب مل جائے۔ ایک دفعہ کچھ لوگ انھیں فرخ سیر کے پاس لے گئے۔ اتفاق سے اُس دن فرخ سیر کو زکام ہو گیا اور وہ دربار میں نہیں آیا۔ مرزا صاحب مایوس لوٹ آئے۔ رات کو انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک بزرگ کے مزار پر گئے ہیں۔ صاحبِ مزار قبر سے باہر آئے اور اپنی ٹوپی اُن کے سر پر رکھ دی۔ وہ بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین تھے۔ اس خواب کے بعد مرزا صاحب کے دل سے حبّ جاہ و منصب جاتی رہی۔[4] مصحفی اس مدت میں مرزا صاحب کے مشاغل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "والد کی وفات کے بعد مرزا صاحب کو بہت مال واسباب ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے محفل آرائی اور دعوتِ یاراں میں سب دولت ختم کر دی اور سولہ سال کی عمر میں سب کچھ ختم کر کے درویشی اختیار کر لی۔"[5] مصحفی کا یہ بیان درست نہیں ہے کیونکہ مرزا جان

۱۔ اس وقت مرزا صاحب کی عمر بیس سال تھی۔ ۲۔ خط نمبر ۱

۳۔ نعیم اللہ بہرائچی نے یہ مدت دو سال بتائی ہے۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۶

۴۔ مرزا مظہر جانجاناں اور اُن کا اردو کلام، ص ۳۹۔ ۵۔ عقدِ ثریا، ص ۵۵

نے ترکِ دنیا اس حد تک کیا تھا کہ گھر میں سے کدو کی بیل بھی اُکھاڑ پھینکی تھی۔ اِس لئے اُن کے پاس دولت کا سوال ہی نہیں تھا۔

والد کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد مرزا صاحب کو بزرگوں کے نیاز حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں اس زمانے میں شیخ کلیم اللہ چشتیؒ، شاہ غلام محمد موحدؒ، میر ہاشم جالیسری وغیرہ کی خدمت میں حاضر ہوا[1]۔ ایک دن مرزا صاحب اپنے دوستوں میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ کسی نے حضرت سید نور محمد بداؤنی کا ذکر اس انداز میں کیا کہ مرزا صاحب کے دل میں ان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ وہ اُن بزرگ کا ذکر سُن کر اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً ملاقات کو گئے۔ جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا۔ حضرت سید نور محمد بدایونی کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی اُن کے ہاتھ پر بیعت کرنے آتا تو پہلے اس شخص کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے اور پھر استخارہ کرتے۔ اگر استخارہ حق میں ہوتا تو مرید کرتے ورنہ انکار کر دیتے۔ لیکن مرزا صاحب کی صلاحیت اور استعداد سے متاثر ہو کر انھوں نے مرزا صاحب کو فوراً اپنا مُرید بنا لیا۔[2]

چار سال پیر و مرشد کی خدمت میں رہ کر انھیں ولایتِ کبریٰ و خرقہ و اجازتِ مطلق حاصل ہو گئی۔[3]

۱۱۳۵ھ (۲۳-۱۷۲۲ء) میں حضرت سید نور محمد بدایونی کا انتقال ہو گیا۔ مرزا صاحب چھ سال تک اپنے مرشد کے مزار کی مجاوری کرتے رہے۔[4] پھر انھوں نے حضرت جیو سے حدیث پڑھی۔[5] جب حضرت جیو کا انتقال ہو گیا تو مرزا صاحب حضرت شاہ گلشن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے انھیں حضرت محمد زبیر کی

۱۔ مقاماتِ مظہری، ص ۱۵۔ ۲۔ معمولات مظہریہ، ص ص ۱۶ - ۱۵

۳۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۵۔ ۴۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۵

۵۔ ایضاً ص ۱۶۔

خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔ مرزا صاحب حضرت زبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ تم حضرت سیّد نور محمد بدایونی سے نسبتِ صحیحہ حاصل کر چکے ہو تمہارے لیے وہی کافی ہے۔ مرزا صاحب حضرت سیّد حافظ سعد اللہ کی خدمت میں پہنچے۔ ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء۔۱۷۴۰ء) میں حافظ صاحب کا انتقال ہو گیا تو مرزا صاحب حضرت شیخ محمد عابد سنامی کی خدمت میں رہنے لگے۔ شیخ کی وفات ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں ہوئی اور مرزا صاحب شیخ صاحب کی وفات تک اُن سے استفادہ کرتے رہے۔[۱]

مدّتوں بزرگوں سے کسبِ فیض کے بعد مرزا صاحب نے خود رُشد و ہدایت کا کام شروع کیا۔ نعیم اللہ بہرائچی کا بیان ہے کہ اُن کے نام کی رعایت سے اُن کے طریقے کو طریقۂ شمسیہ مظہریہ کہتے تھے۔

مرزا صاحب کا حُلیہ

مرزا صاحب دراز قد تھے۔ عمامہ بطور سنّت باندھتے تھے۔ لباس بہت معمولی مگر صاف۔ قمیض پیش چاک پہنتے تھے۔[۲] انشاء اللہ انشاؔ نے مرزا صاحب سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مرزا پیراہن پہنے ہوئے تھے۔ سر پر سفید کلاہ تھا اور نا سپالی رنگ کا ایک دوپٹہ سموسہ بنا کر کاندھوں پر ڈالے ہوئے تھے۔"[۳]

کریم الدین نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی خشخشی داڑھی تھی۔[۴] مرقعِ شعراء مرتبہ رام بابو سکسینہ میں مرزا صاحب کی تصویر موجود ہے۔ جس میں مرزا صاحب

۱۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ص ۱۶ - ۱۵۔

۲۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۲۷۔

۳،۴۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ، دریائے لطافت، مرشد آباد، ۱۲۶۶ھ، ص ۳۹

کے پٹے بال ہیں۔ کشادہ پیشانی، باریک بھویں، بڑی بڑی آنکھیں لمبی وسُتواں ناک اور گھنی داڑھی ہے۔ بعض محققین کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ "مرقع شعرا" ایک جعلی کتاب ہے۔

نعیم اللہ بہرائچی نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب بہت خوبصورت، وجیہہ اور تندرست انسان تھے۔ نعیم اللہ لکھتے ہیں کہ "سامع خاں جو شاعر ہیں کہتے ہیں کہ ایک دن میں ایک ایسے مکان میں جو سڑک کے کنارے تھا۔ شیخ محمد علی حزیں کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک حضرت مرزا صاحب گھوڑے پر سوار ادھر سے گزرے۔ جب حزیں کی نظر اُن پر پڑی تو پوچھا کہ یہ کون جوان ہے؟ میں نے کہا کہ حضرت مرزا جانِ جاناں ہیں۔ شیخ نے کہا۔ چشمِ بد دُور "ہمہ دانی و ہمہ جانی"۔[1]

مرزا صاحب کی شریکِ حیات

مرزا صاحب کی ازدواجی زندگی بہت تلخ تھی۔ اُن کی شریکِ حیات مزاج کی بہت تیز تھیں بات بات پر بہت لڑتی تھیں اور "عارضۂ جنون" کی شکار تھیں۔ نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب نے اپنے عزیز ترین مرید قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو وصیت کی تھی کہ ہم نے بتیس ۳۲ سال یا شاید اس سے بھی زیادہ اُن (بیوی) کی نازبرداری کی ہے، ہمارے بعد تم بھی اُن کے ساتھ یہی رویّہ رکھنا۔[2] وصیت نامے میں یہ کہنا کہ "ہم نے بتیس سال اُن کی ناز برداری کی"، کا مطلب یہ ہے کہ مرزا صاحب نے بہت بڑی عمر میں اُن سے شادی کی تھی۔ کیونکہ وفات کے وقت مرزا صاحب کی عمر تقریباً بیاسی ۸۲ سال تھی۔

۱۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۱-۱۰۔ ۲۔ بشاراتِ مظہریہ، (قلمی) ورق ۱۶۷ ب

مرزا صاحب اپنی بیوی سے بہت آزردہ رہتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "آج کل بیوی کے ہاتھوں زندگی سے عاجز ہوں۔ کیونکہ پریشانی، تنگ دستی اور قرض کی وجہ سے اُن کا پاگل پن جوش پر ہے۔" ۱

مرزا صاحب اپنے مُریدوں سے بیوی کی بدسلوکی کی شکایت کرتے لیکن جن دنوں میں اُن کا رویّہ ٹھیک ہو جاتا مرزا صاحب اُن کی تعریف بھی کرتے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "میری بیوی آدمیت میں عمرِ گذشتہ کا کفارہ کر رہی ہیں۔ خدا ان کی اس وضع کو استقامت دے۔" ۲

مرزا صاحب کی وفات پر قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے ان کی بیوی کو پانی پت بلا لیا۔ اور غالباً وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

اولاد

مرزا صاحب کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ اُن کے صاحبزادے بھی تھے جن کا نام پیر علی تھا۔ مرزا صاحب کی بیوی قاضی ثناء اللہ کے پاس پانی پت جانے والی تھیں ان کی رخصت سے پہلے مرزا صاحب قاضی صاحب کو لکھتے ہیں۔

.... تمہیں چاہیئے کہ جب وہ پہنچیں تو ان کی دلجوئی اور خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو .... اگر فقیر کو پیٹھ پیچھے برا کہیں تو ہرگز مقابلہ نہ کرنا اور اُن سے ہرگز بد دل نہ ہونا۔ کیونکہ ہماری تمہاری خیریت اسی میں ہے۔ لیکن جب بات حد سے گزر جائے تو پیر علی کے مشورے سے جو مناسب ہو کرنا کیونکہ وہ ان کا ایک حصہ ہونے کے باوجود فقیر کا طرفدار ہے اور ان کا مزاج داں بھی ہے .... پیر علی شورِ سودائے موروثی رکھتا ہے۔ اس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ چاہو تو نہ دکھانا۔ کہیں اپنی والدہ کے پاگل پن سے تنگ آکر دور نہ چلا جائے۔ دعا کرو ان سودائیوں

۱۔ مکاتیب مرزا مظہر، ص ۷۵ ۲۔ مکاتیب مرزا مظہر، مکتوب ۷۴

کا مزاج ٹھیک ہو جائے۔"۱

ایک اور خط میں مرزا صاحب لکھتے ہیں۔ "خدا کرے سودائیوں کے شور و شر سے کچھ دن محفوظ رہوں"۔۲

پہلے خط میں تو بالکل واضح ہے کہ مرزا صاحب کے ایک صاحبزادے پیر علی تھے جو اپنی والدہ کی طرح سودائی تھے۔ دوسرے خط میں مرزا صاحب نے "سودائیوں" لکھا ہے جس کا مطلب ہے کہ گھر میں ایک سے زیادہ سودائی تھے۔ بیوی کے علاوہ اگر کوئی اور سودائی ہو سکتا تھا تو غالباً یہی پیر علی ہوں گے۔ پیر علی کا ذکر ایک اور خط میں اس طرح آیا ہے۔ مرزا صاحب قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو لکھتے ہیں۔ "بارش پڑنے کے بعد ۲۴ر محرم کو مردم محل کی رخصت قرار پائی اس ماہ کی ۲۳ر تاریخ یعنی یک شنبہ کی شام کو سواری بار برداری مع ساتھ کے لوگ دروازے پر آگئے۔ اسی وقت پیر علی کے گھر میں ولادت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور تدبیر کا ورق الٹ گیا۔ روانگی موقوف ہو گئی"۔۳

نعیم اللہ بہرائچی نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی نے اپنے عزیز کو گود لے رکھا تھا جس کا نام علی تھا۴ ممکن ہے یہی صاحب پیر علی ہوں۔ بقول نعیم اللہ پیر علی اور اُن کے دو صاحبزادے عبداللہ اور نظامی تینوں نکمے تھے۔۵

مرزا صاحب کی شہادت

مرزا صاحب کی وفات تقریباً بیاسی سال کی عمر میں ہوئی۔ اس لیے وفات سے بہت پہلے ہی اُن کی صحت جواب دے چکی تھی۔ مرزا صاحب نے ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۰ء) میں شہادت پائی ـــــ

۱۔ مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، خط نمبر ۸۷ ۲۔ مکاتیب مرزا مظہر، ص ۶۵

۳۔ مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، خط نمبر ۸۰

۴ و ۵۔ بشارات مظہریہ (قلمی) ورق ۱۶۱ ب

۱۱۷۸ھ[۱] (۱۷۶۴ء) کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "ضعفِ بصر کی وجہ سے تحریر میں رونق باقی نہیں رہی اور لکھنے کی طاقت بھی باقی نہیں۔ اس کے بعد دوست خطوط کے جواب سے معذور سمجھیں"[۲]۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ "اب فقیر میں چلنے پھرنے کی طاقت اور سیر و سیاحت کا دماغ باقی نہیں"۔[۳]

آخری عمر میں مرزا صاحب کی صحت بہت خراب ہوگئی تھی۔ ان کے لیے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا بھی مشکل تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "کمزوری کی وجہ سے خطوط کا جواب نہیں لکھ سکتا۔ اب دوستوں کو لکھ دیا ہے کہ جواب کے منتظر نہ رہا کریں کیونکہ اب میں معذور ہوں اور مجھ میں جامع مسجد جانے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ اب گھر بھی نہیں جاتا۔ کمزوری اور ناتوانی حد سے گزر گئی ہے۔ بہت سے امراض نے گھیر لیا ہے۔ نماز میں کھڑے ہو کر صرف فرض ادا کرتا ہوں اور بس . . . . . چار درم کے برابر غذا باقی رہ گئی ہے"[۴] ایک اور خط میں لکھتے ہیں "وقتِ رحلت قریب آگیا ہے۔ اسّی سے اوپر عمر ہو چکی ہے۔ چونکہ مجھ میں سفر و سیر کی طاقت اور تمہیں فرصت نہیں اسلئے ملاقات کی توقع نہیں ہے۔"[۵]

عجیب بات ہے کہ مرزا صاحب کو شہادت کی بہت تمنا تھی۔ بقول صاحبِ معمولاتِ مظہریہ اکثر مرزا صاحب کہا کرتے تھے کہ جب جوانی میں شہادت نصیب نہ ہوئی تو اب بڑھاپے میں کیا توقع ـــ لیکن خدا کی ذات سے نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ بیاسی سال کی عمر میں مرزا صاحب کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس حملے کی تفصیل شاہ غلام علی کی زبانی سنیئے۔

۱۔ اس خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ مگر مرزا صاحب نے اس خط میں تھانیسر پر سکھوں کے حملے کا ذکر کیا ہے۔ یہ حملہ ۱۷۶۴ء میں ہوا تھا۔

۲۔ کلماتِ طیبات، ص ۴۵-۴۴

۳۔ ایضاً، ص ۵۴

۴۔ کلماتِ طیبات، ص ۷۴

۵۔ ایضاً، ص ۵۴-۵۳

"کچھ رات گزری تھی کہ کچھ لوگوں نے حضرت کے دروازے پر دستک دی۔ خادم نے اُن سے عرض کیا کہ کچھ مرید ملاقات کو آئے ہیں۔ کہا لے آؤ۔ ان میں سے تین آدمی دروازے کے اندر آگئے۔ ان میں ایک مغل تھا۔ حضرت خوابگاہ سے باہر آئے۔ اور ان لوگوں کے برابر کھڑے ہو گئے۔ مغل نے پوچھا مرزا جانجاناں آپ ہیں۔ مرزا نے جواب دیا۔ "ہاں" باقی دو ساتھیوں نے بھی تصدیق کی۔ مرزا جانجاناں یہی ہیں۔ پھر اس بد بخت نے ان پر طمانچہ کی گولی ماری۔ گولی سینے پر دائیں طرف دل کے قریب لگی۔ بڑھاپے کی کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے مرزا میں طاقت نہیں تھی۔ زمین پر گر گئے۔"[1] (فارسی سے ترجمہ)

دوسرے دن صبح نجف خاں نے ایک فرنگی جراح کو بھیجا اور کہلوایا کہ قاتل کا سراغ نہیں مل سکا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو بتائیے تاکہ اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔ نجف خاں شاہ عالم بادشاہ کا وکیل مطلق تھا۔ یہ شیعہ تھا۔ اور اس کی وجہ سے مغل دربار میں شیعت کو بہت فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ مرزا صاحب اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ اس لیے نجف خاں ہی نے اُن پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔ جیسا کہ اس عہد کی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے نجف خاں کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور کہلوایا اگر خدا کی مرضی ہے کہ میں صحت یاب ہو جاؤں تو یہ زخم ٹھیک ہو جائے گا۔

اس لیے فرنگی جراح کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس شخص نے یہ کام کیا ہے ہم نے اسے معاف کر دیا۔ اگر تم اس شخص کو تلاش کر لو تو معاف کر دینا۔[2]

مسلمان جراح مرزا صاحب کا علاج کرتے رہے۔ لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ تین دن تک مرزا صاحب بسترِ مرگ پر پڑے رہے ان تین دنوں کا حال شاہ غلام علی کی زبانی سنیئے۔

۱۔ مقاماتِ مظہری، ص ۶۱

۲۔ مقاماتِ مظہری، ص ۶۱

"تین دن تک بقیدِ حیات رہے۔ ہر روز کمزوری بڑھتی گئی۔ انتہائی کمزوری کی وجہ سے اُن کی آوازِ مبارک سنائی نہیں دیتی تھی۔ تیسرے دن جمعہ تھا۔ صبح کی نماز کے بعد سے بندے سے پوچھا کہ ہماری گیارہ نمازیں قضا ہو چکی ہیں اور تمام جسم خون آلود ہے۔ سر اٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر مریض میں سر اٹھانے کی طاقت نہ ہو تو نماز کو موقوف کر دینا چاہیئے۔ اس مسئلے میں تمہیں کیا معلوم ہے۔ عرض کیا مسئلہ تو وہی ہے جو آپ نے فرمایا۔ آدھا دن گزرنے کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے...... پوچھا کتنا دن باقی ہے۔ عرض کیا، کہ چار گھڑی۔ فرمایا کہ ابھی تک مغرب میں وقت ہے۔ ہفتے کی رات (۱۰ محرم الحرام) کو مغرب کی نماز کے وقت دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور انتقال فرما گئے۔"[۱]

مولانا فخر الدین[۲] نے جنازے کی نماز پڑھائی۔[۳]

مرزا صاحب کی تاریخِ وفات

مرزا صاحب کا انتقال ۱۰ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۰ء) کو ہوا۔ ان کے شاگرد خواجہ احسن اللہ خاں بیانی نے تاریخ وفات کہی۔

تاریخ وفات مظہر کل گردید

۱۱۹۵ھ

۱۔ مقاماتِ مظہری، ص ۶۱

۲۔ عیوض علی لکھتے ہیں "مرزا اور مولانا فخر الدین میں کشیدگی تھی لیکن مرزا صاحب زخمی ہوئے تو مولانا تشریف لے گئے۔ تجہیز و تکفین میں بھی شریک ہوئے۔ بعضے لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ جب مولانا نے مرزا صاحب کو دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انھوں نے فرمایا کہ مرزا غنیمت تھے" قواعد فخریہ (قلمی) ورق ۳۶ ب۔ ۳۔ مناقب فخریہ (قلمی) ص ۳۵

قمرالدین منتؔ نے حدیثِ نبوی کے الفاظ سے تاریخ نکالی

عاش حمیداً ومات شہیداً

سوداؔ نے یہ قطعہ تاریخ کہا

مرزا کا ہوا قاتل ایک مرتد شوم
اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ زروئے درد یہ سن کے کہی
سوداؔ نے کہ ہائے جانجاناں مظلوم

۱۱۹۱ + ۴ = ۱۱۹۵ھ

مرزا صاحب کا مزار

مرزا صاحب نے اپنے وصیت نامے میں لکھا تھا کہ:

"چند روز پہلے میری بیوی نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اپنے امورِ اخروی ان پر چھوڑ دوں۔ میں نے اس سلسلے میں انھیں ایک تحریر دے دی ہے تاکہ میرے بعد میرے مخلص اُن کی مخالفت نہ کریں اور وہ جہاں چاہیں مجھے دفن کریں۔ میں نے اس بات کا زبانی اقرار کرلیا ہے۔ لیکن اُن دنوں یہ مستورہ کسی قطعہ زمین کی مالک نہ تھی۔ حال ہی میں انھوں نے ایک حویلی خرید لی ہے۔ میں اس جگہ سے سخت متنفر ہوں۔ اگر وہ چاہیں کہ مجھے اس جگہ دفن کریں تو دوستی کے تقاضے سے میرے احباب پر واجب ہے کہ ہرگز یہ بات قبول نہ کریں۔ ہاں اس جگہ کے علاوہ جہاں کہیں بھی جگہ مہیا ہو۔ ان کی مرضی کا خیال رکھیں۔ بیرونِ ترکمان دروازہ مناسب تر جگہ ہے۔"[1]

---

[1] : مرزا صاحب کا وصیت نامہ اس کتاب میں شامل ہے۔

مرزا صاحب کی اتنی سخت تاکید کے باوجود انھیں اسی حویلی میں مدفون کیا گیا جس سے وہ متنفر تھے۔ اس کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ دس سال بعد مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے مرزا صاحب کے مزار کی تعمیر کرائی![1] مرزا صاحب کا مزار سنگِ مرمر کے بہت خوبصورت مجحر میں ہے۔ لوحِ تربت پر یہ عبارت کندہ ہے:

مزارِ حضرت جانجاناں مظہر شہید قدس سرہٗ ۱۱۹۵ھ تاریخ دہم محرم

بہ لوحِ تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

اس شعر کے بارے میں مصحفی نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی وفات کے بعد ان کے ایک نیاز مند نے اُن کا دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا۔ چنانچہ لوحِ مزار پر یہی شعر لکھوا دیا گیا۔[۲] مصحفی نے یہ تذکرہ ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۰ء) اور ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) کے درمیان تالیف کیا تھا۔ مرزا صاحب کی وفات ۱۱۹۵ھ میں ہوئی۔ اس کا مطلب ہے کہ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) میں لوحِ تربت پر یہ شعر لکھا ہوا تھا۔ جبکہ مرزا سنگین بیگ ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ء) میں لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کے مزار پر یہ قطعہ لکھا ہوا ہے ؎

آہ مظہر تو کجائی کہ پئے جستن تو
گل جدا، بوئے جدا، رنگ جدا می گردد
مظہرِ آں پاک گہر کو کہ بگرد سرِ او
مہ جدا مہر جدا چرخ جدا می گردد[۳]

اِس قطعہ کا ذکر کسی اور کتاب میں نہیں ملتا۔ عبدالرزاق قریشی صاحب نے مرزا صاحب کی درگاہ (جواب درگاہ شاہ ابوالخیر کے نام سے مشہور ہے) کے سجادہ نشین مولانا ابوالحسن

۱۔ معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۴۵ ۔۔۔ ۲۔ عقدِ ثریا، ص ۵۵

۳۔ مرزا سنگین بیگ، سیر المنازل، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۸۰ء ص ۵۵۔

زید فاروقی صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ لوحِ مزار پر کتبہ کبھی نہیں تھا، بلکہ مزار کے دروازے پر تھا۔ یہ کتبہ ۱۳۴۵ھ یا ۱۳۴۶ھ میں آندھی کی وجہ سے گر کر قطعہ قطعہ ہو گیا تھا۔ اور انھوں نے ۳۷ سال کے بعد۔۔۔ اسی ڈھب کا کتبہ ۱۲ جمادی الآخر ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۲ء) کو دروازے کے اوپر لگوا دیا۔ امیرے خیال سے ایک کتبہ مزار پر تھا اور ایک دروازے پر، دونوں گر گئے۔ مولانا فاروقی نے دروازے والا کتبہ لگوا دیا اور مزار والا کتبہ اتنے پہلے گرا کہ مولانا فاروقی کے علم میں نہ آسکا۔ کیونکہ بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ مرزا سنگین بیگ اِس سلسلے میں دروغ گوئی سے کام لیں۔

مرزا صاحب کا وصیت نامہ

حمد و صلوٰۃ کے بعد فقیر جانجاناں محمدی مجدّدی اس حالت میں کہ جس میں اقرار و منقر صحیح و معتبر ہے ان احباب کو چند وصیتیں کرتا ہے جنھوں نے اس سے اخذِ طریقہ کیا ہے۔ فقیر کی تجہیز و تکفین کے لئے سنّتِ نبوی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ اس کے بعد میرے مزار پر دُکان نہ لگائی جائے۔ کیونکہ میں زندگی میں بھی اس کا مخالف تھا۔ میں بندگانِ خدا میں سے ایک ہوں اور میں نے خدا کے نام پر تعلیم دی ہے اور بس۔

چند روز پہلے میری بیوی نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اپنے اُمورِ اُخروی کی تدبیران پر چھوڑ دوں۔ میں نے اِس سلسلے میں انھیں ایک تحریر دے دی ہے تاکہ میرے بعد میرے مخلص ان کی مخالفت نہ کریں اور وہ جہاں چاہیں مجھے دفن کریں۔ میں نے اِس بات کا زبانی اقرار کر لیا ہے لیکن اُن دنوں یہ مستورہ کسی قطعۂ زمین کی مالک نہ تھیں۔ حال ہی میں انھوں نے

۱۔ مرزا مظہر جانجاناں، ص ۷۳

ایک حویلی خریدلی ہے ۔میں اس جگہ سے سخت متنفر ہوں ۔ اگر وہ چاہیں کہ مجھے اس جگہ دفن کریں تو دوستی کے تقاضے سے میرے احباب پر واجب ہے کہ ہرگز یہ بات قبول نہ کریں۔ ہاں اس جگہ کے علاوہ جہاں کہیں بھی جگہ میسر ہو ان کی مرضی کا خیال رکھیں بیرونِ ترکمان دروازہ مناسب تر جگہ ہے ۔

اس مستورہ نے عارضۂ سودا اور طویل عمری کی وجہ سے مجھے پریشان کیا ہے جو دوستوں سے مخفی نہیں ہے ۔لیکن میں نے سب معاف کردیا ہے ۔ اُس محبّت کے خیال سے جو انھیں خدا اور رسول سے ہے ۔میرے مخلصوں پر میرے حقِ وفا کے مطابق ان کی دلجوئی لازم ہے ۔

میرے مخلصوں کو یہی وصیت کافی ہے کہ دمِ آخر تک اتّباع سنّت میں کوشاں رہیں ۔ اور خدا کے سوا کسی کو مقصودِ حقیقی اور آنحضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کو متبوع واجب الاتباع نہ سمجھیں فقیروں کے طور طریق اپنائیں اور دنیاداروں سے ملنے ہلانے سے گریز کریں ۔ علومِ دین کے شغل سے خود کو معذور نہ رکھیں ۔ اللّٰھم وفقھم ![1] (ترجمہ)

مرزا صاحب اور تصوّف

ہندوستان میں تصوف کی باقاعدہ داغ بیل چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاتھوں پڑی جو پرتھوی راج کے عہد میں ہندوستان آئے تھے ۔ اگرچہ خواجہ صاحب سے پہلے بھی ہندوستان میں بہت سے بزرگ آئے تھے مگر تاریخ میں ان کے حالات پوری طرح روشن نہیں ہیں ۔

خواجہ صاحب نے ہندوستان آکر اجمیر میں قیام کیا جہاں تمام عمر رشد و ہدایت میں

---

[1] وصیت نامہ فارسی میں ہے، یہاں اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے ۔

مصروف رہے۔ تصوّف کے ایک اور مشہور سلسلے "سہروردیہ" کے ایک بزرگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا بھی ہندوستان آئے اور انھوں نے ملتان اور سندھ کو مرکز بنایا۔ اس زمانے میں ایک اور سلسلہ "فردوسیہ" ہندوستان میں قائم ہوا، جسے حضرت شیخ بدرالدین سمرقندی نے ہندوستان میں جاری کیا۔ پندرھویں صدی کے وسط تک شاہ نعمت اللہ قادری جو قادری سلسلے کے بزرگ تھے اور شطاریہ سلسلے کے ایک بزرگ شاہ عبداللہ شطاری ہندوستان آچکے تھے۔

اکبر کے عہد میں حضرت خواجہ باقی باللہ نے نقشبندیہ سلسلہ ہندوستان میں قائم کیا۔ یہی چند بڑے بڑے سلسلے ہیں، جنھوں نے پندرھویں صدی عیسوی سے لیکر انیسویں صدی کے آخر تک تمام ہندوستان میں خانقاہی نظام کو منضبط اور منظم کر کے چلایا اور اپنے حلقۂ اثر میں اصلاح کی۔ آج بھی ہندوستان کی تمام معروف اور قابلِ ذکر خانقاہوں کا سلسلہ انہیں بزرگوں سے ملتا ہے۔

ہندوستان میں تصوّف صحت مند، ترقی پسند اور توانا اقدار لے کر ہندوستان آیا تھا۔ اسی لیے بہت جلد تصوّف نے ایک عظیم تحریک کی صُورت اختیار کرلی تھی۔ صوفیائے کرام ایک طرف حکمراں طبقے کے ظلم و استبداد کے خلاف جہاد کرتے تھے اور دوسری طرف بے بس اور لاچار و مجبور انسانوں کو صبر و قناعت، تسلیم و رضا نیز انسانی عظمت اور خودداری کا درس دے کر ان میں خوداعتمادی اور بلند کرداری پیدا کرتے تھے۔ یہ انھیں صوفیاء کا فیض تھا کہ حکمراں طبقے کی گمراہیوں اور عیاشیوں کے باوجود مذہبی عقائد میں ایسا زوال پیدا نہیں ہوا جو عام لوگوں کو اس سے منحرف کردیتا یا حالات کا بہاؤ انھیں کسی اور طرف لے جاتا۔ صوفیاء بناوٹ، تصنّع اور کٹ ملاؤں کے ظاہری فریب سے بچ کر باطنی تربیت، تقویٰ، طہارتِ نفس کی تعلیم دیتے تھے، یہ بزرگ اتباعِ سنّتِ نبوی پر زور دیتے اور احترامِ شریعت کو

ملحوظ رکھتے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی نے ایک بار اپنے مُرید کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلکِ پیر حجت نہیں ہوتی کتاب وسنت سے دلیل لینی چاہیئے۔

تصوّف مردم بیزار نہیں ہوتا۔ اس میں انسان دوستی، زندگی کی اعلیٰ قدروں پر ایمان، سچائی، صداقت اور انسانی عظمت کا احساس تھا۔ یہ کہنا صریحاً غلط ہے کہ صوفیا رہبانیت کے قائل تھے، یا وہ عوام کو ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے تھے — اُن کا مقصدِ اصلاح یہ تھا کہ اخلاق کی تربیت کی جائے۔ اکلِ حلال حاصل کیا جائے عیش کوشی اور لذاتِ دنیا سے کنارہ کشی کرکے کتاب وسنّت کی پیروی میں ثابت قدم رہا جائے۔ یہ دنیا میں بہتر زندگی گزارنے کے وسائل تھے، ترکِ دنیا کے نہیں حضرت نظام الدین اولیا فرماتے تھے کہ:

ترکِ دنیا یہ نہیں ہے کہ کوئی برہنہ ہو جائے اور لنگوٹی باندھ لے۔
ترکِ دنیا یہ ہے کہ کپڑے پہنے، کھانا کھائے۔ لیکن جو کچھ ملے اسے خرچ کردے
اور اسے جمع کرنے پر راغب نہ ہو۔ دل کو دنیا کی چیزوں سے نہ لگائے۔
یہ ہے ترکِ دنیا۔ ۱

حضرت بندہ نواز گیسو دراز اپنے مریدوں کو تعلیم دیتے تھے:

دوستوں کی ضیافت فقیروں کو کھانا کھلانے سے بہتر ہے۔ ہاں اگر کوئی
صلہ رحمی ہو تو اس کا حصّہ مقدّم رکھنا چاہیئے۔" ۲ (ترجمہ)

حضرت گیسو دراز کے دو مرید ملک عزیز الدین اور ملک شہاب الدین شاہی ملازمت میں تھے۔ انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

جو کام کر رہے ہو کرتے رہو۔ چاہیئے کہ خدا کے ساتھ رہو اور طلبِ مقصود

۱۔ خواجہ میر حسن علا سنجری، فوائد الفواد، مطبع نولکشور، ص ۹۔

۲۔ خاتمہ شریف، ص ۴۴۔

میں لگے رہو۔

اہلِ طریقت کو ظاہری لباس کی تمنّا نہیں ہوتی۔ بادشاہ کی خدمت پر کمر باندھ لیکن صوفی رہ۔ بادشاہ کی ملازمت، باپ کی خدمت اور متعلقان کے حقوق کی ادائیگی سے نقصان نہیں پہنچتا۔ تم خدا اور اپنے پیر کی طرف متوجّہ رہو۔ جو کر رہے ہو کرتے رہو لیکن خلاف شرع کوئی کام نہ کرو۔" ۱

تصوّف کو ہندوستان آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ بعض نا اہل لوگوں کی بداعتدالیوں نے انفرادیت کو فروغ دینا شروع کیا۔ مجہولیت، دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس، بے وجہ قناعت، کلبیت، خود آزاری اور انفعالیت نے تصوّف میں راہ پالی۔ تصوّف جس کا مقصد انسان دوستی تھا، مردم بیزار ہو گیا۔ قرآن، شرع، مذہبی رسوم اور سنّتِ نبوی کا مضحکہ اُڑایا جانے لگا۔ وحدت الوجود کے فلسفے کی تبلیغ کر کے ہر طرح کی عیّاشی اور لذّت پرستی کو جائز قرار دے دیا گیا۔ اس طرح اسلام اور اسلامی تصوّف کی صورت مسخ ہونے لگی۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں یہ صورتِ حال انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

اکبر کی تحریک "دینِ الٰہی" اور حضرت مجدّد الف ثانی کی تحریک "اتباعِ سنت" تقریباً ایک مخصوص حالات کے دو مختلف ردِ عمل ہیں۔ اکبر کی تحریک میں سیاسی مصلحتوں کو دخل تھا۔ جبکہ حضرت مجدّد کی تحریک سو فی صدی مذہبی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ ۱۵۸۵ء میں ابو تراب مکّے سے ایک پتھر لائے جس پر آنحضرت کا نقشِ قدم بتایا جاتا تھا۔ اکبر شہر سے چار کوس دُور اس پتّھر کے استقبال کے لئے گیا اور حکم دیا کہ اُمرائے دربار باری باری اس پتّھر کو لے کر چلیں۔ حضرت شیخ سلیم چشتی سے اکبر کی عقیدت مشہور ہے۔ مگر بعد میں کچھ علماء کی بے دینی، عیّاری اور مکّاری، ہوسِ دولت و جاہ دیکھ کر اکبر علماء اور مذہب دونوں سے متنفّر ہو گیا۔ اس عہد کے علماء پر تبصرہ کرتے

---

۱ مکتوباتِ گیسو دراز، ص ۹۸۔

ہوئے حضرت مجدد لکھتے ہیں :

"دنیا دریائے بدعت میں غرق ہوگئی ہے اور ظلماتِ بدعت میں ڈوب گئی ہے۔ کس میں ہمت ہے کہ بدعت دُور کرنے کی کوشش کرے۔ اور احیائے سنّت کے لئے لب کشا ہو۔ اس زمانے کے اکثر علماء نے بدعت کو رائج اور سنّتِ نبوی کو ختم کیا ہے۔ [۱] (ترجمہ)

مذہبی مسائل میں جب اکبر علمائے دین کا مشورہ طلب کرتا تو ایک عالم ایک چیز کو جائز قرار دیتا اور دوسرا اسی کو حرام۔ اکبر مخدوم الملک سید عبداللہ کی بہت عزت کرتا تھا۔ لیکن اس کی جاہ پرستی، دنیاداری اور غیر انسانی حرکتوں نے اکبر کے عقائد پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے مخدوم الملک کے بارے میں لکھا ہے :

"اتنے خزانے اور دفینے ظاہر ہوئے کہ اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ان میں سونے سے بھرے ہوئے کئی صندوق قبرستان سے نکلے جنہیں مخدوم الملک نے میت کے بہانے سے دفن کیا تھا۔" [۲] (ترجمہ)

انہیں حالات نے اکبر میں تلاش کا جذبہ پیدا کیا۔ اس نے ۱۵۷۵ء میں "عبادت خانہ" کے نام سے ایک عمارت بنوائی۔ اس کے چار حصّے تھے، جن میں سید، علماء، فقہا اور شرفا و امرا بیٹھتے تھے۔ مذہبی مسائل پر مجادلے اور مباحثے ہوتے۔ اکبر کافی عرصے تک ان لوگوں کی بحث و تکرار سُنتا رہا۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر شخص دلایل پیش کرنے کے بجائے جذباتیت، شور و غل اور غم و غصّہ سے دوسروں کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مباحثے صداقت کی طرف رہنمائی کے بجائے ذہنی ورزشیں تھے۔ خانقاہوں کی حالت دیکھ کر اکبر کو اور بھی مایوسی ہوئی۔ بعض اہلِ طریقت

۱۔ حضرت مجدد الف ثانی، مکتوبات مجدد الف ثانی، مرتبہ نعیم الدین اصلاحی، جلد ۲، ص ۱۰۳۔

۲۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، جلد ۱، ص ۳۱۱۔

ایسے تھے کہ جنہیں اخلاق سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔"ہمہ اوست" کے فلسفے کا سہارا لے کر ان لوگوں نے خانقاہوں کو عیش و عشرت، آوارگی اور خلافِ مذہب و اخلاق حرکتوں کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔

اکبر نے دوسرے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا اور بقول عبدالقادر بدایونی:

"تمام شہروں سے دانشمندوں اور مختلف مذاہب کے رہنماؤں کو دربار میں جمع کیا۔ اُن سے خود گفتگو کی۔ (اکبر) دن رات تحقیق و تفتیش میں مصروف رہتا۔"[1] (ترجمہ)

اس تحقیق و تفتیش کے بعد اکبر اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام مذاہب کے رہنما خود غرض، جذباتی اور کٹھ ملا ہیں۔ اس تحقیق کا نتیجہ ہے کہ اس نے "دینِ الٰہی" ایجاد کیا۔

حضرت مجدّد کی تحریک بھی انہیں حالات کا ردِ عمل تھی۔ اس تحریک کو مختصر لفظوں میں "اتباعِ سنّت" اور اجتناب عن البدعت کہا جاسکتا ہے۔ وہ طریقت اور تصوّف کے ان تمام فلسفوں کے خلاف تھے جن میں اشراقیت ویدانت اور عیسائیت کے نظریات کام کر رہے تھے۔ اکبر نے بعض غیر شرعی بلکہ حرام چیزوں کو جائز قرار دیدیا تھا حضرت مجدّد نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ جہانگیر کے دربار میں ان کے تعظیمی سجدے کا واقعہ مشہور ہے۔ جہانگیر نے ایک دفعہ انھیں دربار میں بلایا اور تعظیمی سجدے کے لئے کہا۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ جہانگیر نے یہ آہنی عزم کسی انسان میں نہیں دیکھا تھا۔ غصّے سے بے قابو ہو گیا اور گرفتار کر کے قلعہ گوالیار میں بند کر دیا۔ دو سال تک انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

حضرت مجدّد کی یہ تحریک اورنگ زیب کے ہاتھوں پھلی پھولی۔ ہندوستانی تہذیب سے متاثر ہو کر دربار میں جن غیر اسلامی رسومات کو دخل ہو گیا تھا اورنگ زیب نے

۱۔ منتخب التواریخ، ص ۲۵۶۔

انھیں ختم کر دیا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سنہ شمسی کو جو پارسیوں کی تقلید سے بنایا گیا تھا، قمری سے بدل دیا۔ "درشن" کو غیر اسلامی طریقہ قرار دے کر بند کر دیا۔ سلام کا مسنون طریقہ رائج کیا اور حکم دیا کہ مسلمان سلام کا یہی طریقہ اختیار کریں۔ اورنگ زیب نے ایک اہم کام یہ کیا کہ تصنیف کا محکمہ قائم کیا اور کئی سال کی لگاتار کوششوں کے بعد "فتاویٰ عالمگیری" تیار کرائی۔ اورنگ زیب سے پہلے مغل بادشاہ سکوں پر کلمہ کندہ کراتے تھے اورنگ زیب نے اُسے بند کرادیا تاکہ کلمے کی بے حرمتی نہ ہو۔

مرزا صاحب کے سوانح

مرزا صاحب کے آباؤ اجداد میں دو بزرگ بابا خان اور مجنون خاں ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے[1] یہ دونوں پہلے ہمایوں اور پھر اکبر کی فوج میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔[2] مجنون خان ہندوستان میں قاقشالان کے سردار تھے۔ ان کی وفات کے بعد قاقشالان نے بابا خان کو اپنا سردار بنالیا۔ اکبر کے "آئین داغ[3]" کے سلسلے میں جن لوگوں نے بغاوت کی تھی ان میں بابا خان کا نام بھی آتا ہے۔ اکبر نے بغاوت دبادی لیکن شاہی فتح سے قبل ہی بابا خان کا انتقال ہوگیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس خاندان پر اعلیٰ مناصب کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اس لئے بابا خان کے لڑکے شاہ بابا سلطان اور پوتے مرزا محمد امان کا ذکر تاریخ کے صفحات پر نظر نہیں آتا۔ صرف نعیم اللہ بہرائچی کے درج کئے

---

[1] کلمات طیبات ص ۱۴۱۔ مرزا صاحب نے اپنے خط میں مجنون خان کی بجائے محبوب خان لکھا ہے جو غالباً کاتب کا سہو ہے۔ سرو آزاد ص ۲۳۲۔ تذکرہ سفینہ خوش گو (قلمی ورق ۱۸۷ - ۱۸۸ ب ۔ پٹنہ) معمولات مظہریہ ص ۱۔ میں بھی یہ نام مجنون خان ہے۔

[2] ان بزرگوں کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو مآثر الامرا اول ص ۳۹۱-۳۹۲۔ مآثر الامرا جلد سوم ص ۲۰۹-۲۱۱۔ اکبر نامہ جلد دوم ص ۲۵۷۔ اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۵۰

(بقیہ ص آئندہ پر)

ہوئے شجرۂ نسب سے یہ نام معلوم ہوتے ہیں۔[۱] بقول نعیم اللہ مرزا محمد امان کی شادی اکبر کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ مگر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ مرزا محمد امان کے صاحبزادے مرزا عبدالسبحان کی شادی اسد خاں وزیر کی لڑکی[۲] یا بقول بعض مؤرخین خالہ زاد بہن سے ہوئی تھی۔ اس کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ یہ مرزا مظہر کے جد امجد تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں کسی منصب پر فائز تھے لیکن اورنگ زیب کے منصب داروں کی فہرست میں یہ نام نہیں ملتا۔ مرزا عبدالسبحان جد امجد تھے مرزا صاحب کے۔ مرزا عبدالسبحان کے صاحبزادے مرزا جان اورنگ زیب کے منصب داروں میں تھے[۳] اور یہی مرزا مظہر کے والد تھے۔ اورنگ زیب دکن میں تھا تو انھوں نے ملازمت ترک کردی اور تمام ساز و سامان غریبوں فقیروں میں تقسیم کر دیا۔ صرف پچیس ہزار روپے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے بچار کھے تھے مگر ایک دوست کو ضرورت پڑنے پر وہ بھی دے دیئے۔ مرزا جان ترک جاہ منصب کے بعد اکبر آباد واپس آ رہے تھے۔ راستے میں کالا باغ (مالوہ) میں قیام کیا اور یہیں ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۱۰ھ[۴] کو ان کی ولادت ہوئی۔ جب اورنگ زیب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) آئین اکبری جلد اول ص ۲۲۳۔ عالمگیر نامہ ص ۳۹۵ تذکرہ ہمایوں و اکبر ص ۱۴۱ ۳ ۵۳ آئین داغ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آئین اکبری جلد اول ص ۱۴۴۔

۱۴۵۔ دربار اکبری ص ۵۳۔ ۵۷۔

[۱] معمولات مظہریہ ص ۱۱ [۲] شاہ غلام علی اسد خاں وزیر کی لڑکی لکھتے ہیں۔ مقامات مظہریہ ص ۱۵۔ لیکن نعیم اللہ بہرائچی نے خالہ زاد بہن لکھا ہے۔ معمولاتِ مظہریہ ص ۱۵۔

[۳] غالباً کسی غیر اہم منصب پر فائز تھے۔ ان کا نام کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔

[۴] مختلف تذکروں۔ تاریخوں اور خود مرزا صاحب کے بیانوں سے ان کا سنہ ولادت

(بقیہ حاشیہ — آئندہ پر)

نے مرزا صاحب کی ولادت کی خبر سنی تو اس نے مرزا جان کے نام کی مناسبت سے ان کا نام جان جان رکھ دیا۔[1] شمس الدین حبیب اللہ ان کا لقب تھا۔ اس طرح ان کا پورا نام شمس الدین حبیب اللہ مرزا جان جان اور تخلص مظہر تھا بعد میں جان جان بگڑ کر جان جاناں ہو گیا۔

اور یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ مرزا صاحب اپنے خطوط میں خود بھی یہی نام لکھنے لگے۔ ۱۱۵۴ھ سے قبل ہی ان کا نام بدل چکا تھا۔[2] مرزا جان نے اپنے اکلوتے لڑکے کو آداب بادشاہی، فنون سپاہ گری اور دوسرے مروّج فنون سکھائے تھے۔ انھوں نے رسائل فارسی محاورہ وغیرہ اپنے والد سے پڑھے تھے اور قرآن شریف، علم تجوید اور قرائت کی سند قاری عبد الرسول سے حاصل کی تھی۔ والد کی وفات (۱۱۳۰ھ) کے بعد حاجی محمد افضل سے حدیث اور تفسیر وغیرہ پڑھی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲) ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۳ھ تک کوئی ایک سال قرار پاتا ہے۔ میں نے مختلف دلائل و شواہد کی مدد سے اپنے پی۔ ایچ ڈی کے مقالے "مرزا مظہر جان جاناں" میں ان کا سنہ ولادت ۱۱۱۰ ہجری ثابت کیا ہے۔ عبد الرزاق قریشی ۱۱۱۳ھ تسلیم کرتے ہیں۔ مرزا مظہر جان جاناں ص ۴۶۔ [1] یہ واقعہ نعیم اللہ بہرائچی نے نقل کیا ہے۔ معمولاتِ مظہریہ ص ۹۔ ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق تمام معلومات اسی کتاب سے لی گئیں۔

[2] درگاہ قلی خاں کی "مُرقع دہلی" ۱۱۵۱ھ۔ ۱۱۵۴ھ کے درمیان کی تالیف ہے۔ انھوں نے مرزا صاحب کا نام مرزا جانجاناں بغیر کسی اختلاف کے لکھا ہے۔ خان آرزو نے ۱۱۶۴ھ کی تالیف مجمع النفائس میں لکھا ہے کہ ان کے والد کا نام محمد جان تھا۔ اس لئے مرزا کا نام جانِ جاناں پڑ گیا۔ اور اب مرزا جانِ جان کے نام سے مشہور ہیں۔ مجمع النفائس (قلمی رامپور)

اور پھر علم طریقت و باطنی کی طرف متوجہ ہوئے ۔ اور نقشبندی سلسلے کے ایک بزرگ نور محمد بدایونی سے بیعت ہو گئے[۱] ۔ چار سال تک مرزا کسب سلوک کرتے رہے۔ اور ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۲ء) میں خرقہ اور اجازتِ مطلقہ ملی[۲] ۔ اسی سنہ میں نور محمد بدایونی کا انتقال ہو گیا ۔ مرزا صاحب کو اپنے مرشد سے اتنی عقیدت اور ارادت تھی کہ چھ سال کی طویل مدت تک ان کے مزار پر مجاوری کرتے رہے[۳] ۔ پھر حافظ سعد اللہ کے مرید ہو گئے[۴] اور بارہ سال تک ان کی خدمت گزاری کی ۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا شیخ محمد عابد سنامی سے بیعت ہوئے[۵] ۔ اور اُن سے خرقہ ، اجازت طریقۂ قادریہ سہروردیہ اور نقشبندیہ حاصل کیا[۶] ۔ اور ۱۱۵۵ھ میں خود رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کر دیا[۷] ۔

مرزا صاحب خوبصورت ، وجیہہ اور تندرست آدمی تھے ۔ بقول نعیم اللہ بہرائچی دراز قد تھے ۔ عمامہ باندھتے تھے ۔ لباس بہت معمولی مگر صاف ہوتا تھا ۔ قمیص پیش چاک پہنتے تھے[۸] ۔ انشاء اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

---

[۱] نور محمد بدایونی کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو معمولات مظہری ص ۱۹ - ۲۲ خزینۃ الاصفیاء ص ۷ - ۹ - مزارات اولیائے دہلی ۔

[۲] معمولات مظہریہ ص ۱۵ [۳] خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۹ [۴] معمولات مظہری ص ۱۵ ۔

[۵] مقامات مظہری ص ۱۰ - ۱۱ اور مرقع دہلی ص ۱۹ ۔

[۶] مقامات مظہری ص ۱۱ - ۱۴ ۔ اور معمولات مظہریہ ص ۱۷ ۔

[۷] مرزا صاحب ۱۱۸۵ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ تیس سال سے بندگان خدا کی تربیت میں مشغول ہوں ۔ کلماتِ طیبات ص ۱۴ ۔

[۸] معمولات مظہریہ ص / ۱۶

کہ مرزا صاحب سفید قمیض اور سفید کلاہ پہنے ہوئے تھے اور کاندھوں پر ناشپاتی رنگ کا دوپٹہ سموسہ بنا کر ڈال رکھا تھا۔[۱] مرقع شعراُ مرتبہ رام بابو سکسینہ میں ان کی تصویر موجود ہے جس میں ان کے پٹے بال ہیں۔ کشادہ پیشانی' باریک بھویں بڑی بڑی آنکھیں، لمبی ستواں ناک اور گھنی ڈاڑھی ہے۔ مرزا صاحب بڑے نازک مزاج تھے ان کی لطافت اور نفاست طبع ضرب المثل ہوگئی تھی۔ صاحب نشترِ عشق لکھتے ہیں کہ وہ اتنی نازک اور لطیف طبیعت رکھتے تھے کہ ہرگز کسی دوسرے کا کام انھیں پسند نہیں آتا تھا۔ بلکہ اکثر اپنے گھر کا کام کاج اپنے ہاتھوں سے درست کرتے تھے[۲] اگر چارپائی میں ذرا سی کان ہو تو وہ رات بھر نہ سو پاتے تھے۔ بقول محمود احمد عباسی ایک دفعہ جب مرزا صاحب نے امروہہ میں خانقاہ حضرت شاہ عبدالہادی میں قیام کیا تو وہ رات بھر اس چارپائی پر نہ سو سکے جو باریک ستلی کی نفیس چارپائی ان کے لئے بنوائی گئی تھی۔ صبح کو ناپنے پر معلوم ہوا کہ اس میں ہلکی سی کان تھی۔ محمود صاحب کا بیان ہے کہ یہ چارپائی اب تک (سنہ ۳۲ ۱۹ء زمانہ تالیف تذکرۃ الکرام) خانقاہ میں موجود ہے[۳] اگر لحاف کے نگندے ٹیڑھے سلے ہوتے تو وہ رات بھر سو نہیں سکتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ارواح ثلاثہ میں بیان کیا گیا ہے۔[۴]

غرض ان کی نازک مزاجی اور لطافتِ طبع کا ذکر اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں مختلف واقعات بیان کئے ہیں۔ ان کے مریدوں نے مرزا صاحب کی اس خوبی کے بیان میں اتنا غلو کیا کہ یہ ان کی خرابی نظر

---

[۱] دریائے لطافت ص ۳۹۱ [۲] نشترِ عشق (قلمی) ص ۱۲۵۵

[۳] تذکرۃ الکرام جلد دوم ص ۱۵۵۔

[۴] ارواح ثلاثہ ص ۲۵-۲۶

آنے لگی۔[۱]

حالانکہ وہ انتہائی مہذب باخلاق اور دوسروں کے دکھ درد میں حصّہ لینے والے انسان تھے۔ ان کا توکل اس حد تک تھا کہ دولت مندوں سے ملنے یا ان کے پیش کئے ہوئے تحفے قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ وہ پابندی کے ساتھ جمعرات کو جامع مسجد جاتے تھے اور یہیں ان کے شیدائی امراء و روساء ملاقات کا شرف حاصل کرتے تھے۔[۲] لیکن اگر وہ کچھ پیش کرنا چاہتے تو مرزا صاحب صاف انکار کر دیتے۔ کسی امیر نے ان کے رہنے کے لئے ایک حویلی اور خانقاہ اور غریبوں کے لئے آمدنی کے کچھ ذرائع خدمت میں پیش کئے مگر مرزا نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ جب مکان چھوڑ کر ہی جانا ہے تو اپنا ہو یا دوسرے کا سب برابر ہے اور ہر شخص کی روزی خدا کے ہاتھ ہے جو ہر حالت میں پہنچتی ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ شاہ غلام علی نے بھی بیان کیا ہے۔ ایک دفعہ محمد شاہ بادشاہ نے اپنے وزیر قمرالدین خان کی معرفت کہلوایا کہ خدا نے ہمیں ملک عطا کیا ہے جو علاقہ آپ کی سمجھ میں آئے قبول فرمائیے۔ انھوں نے جواب دیا "خدا نے فرمایا ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ۔ متاع ہفت اقلیم قلیل فرمودہ است۔ نزدِ شما ہفتم حصّہ آں قلیل یک اقلیم ہندوستان است۔ پیشِ شما چیست کہ سرِ فقیر البقولِ آں فرود آید"[۳] مرزا صاحب کے صبر و استغناء و توکل سے متعلق اس قسم کے بہت سے واقعات مشہور رہیں۔

---

[۱] صاحبِ قواعدِ فخریہ نے مولانا فخرالدین شاہ ولی اللہ اور مرزا مظہر سے متعلق ایک واقعہ بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ مرزا زود رنج اور بد دماغ انسان تھے۔ قواعدِ فخریہ آصفیہ لائبریری حیدر آباد قلمی ورق ۳۴ب۔ [۲] مقامات مظہری ص ۳۴۔ [۳] مقامات مظہری ص ۳۴۔

ان کی خوش گفتاری معجز بیانی اور آداب مجلس کا ذکر اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ قدرت اللہ صدیقی لکھتے ہیں "وہ اس مرتبہ کے خوش تقریر ہیں کہ تحریر میں نہیں آسکتا"[1] اشرف علی خاں کافی عرصہ تک مرزا کی صحبت اور رفاقت میں رہے تھے۔ ان کی ذہانت، ذکاوت، خوش گفتاری اور فصاحت بیانی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "کہ دقتِ فہم ذکاءِ طبع، سلاستِ گفتگو، فصاحتِ کلام اور خوش گوئی میں یکتائے لیل ونہار اور بے مثل روزگار ہیں"[2] ان کے ایک اور ہمعصر بھگوانداس ہندی نے ان کی معجز بیانی کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ شعر اس انداز سے پڑھتے تھے کہ سننے والے کے دل میں اتر جاتے تھے۔ بہت سے لوگ تو ان کی سحر کار زبان سے اشعار سننے اور محظوظ ہونے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ مرزا صاحب کی لطافت ونزاکتِ طبع کی طرح ان کی حسن پرستی بھی مشہور رہی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ شیر خوارگی کے زمانے میں بھی وہ خوبصورت عورت کی گود میں جانا پسند کرتے تھے اور بدصورت عورت کی گود میں نہیں جاتے تھے۔[3] اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کی حسن پرست طبیعت کا ذکر کیا ہے۔ فضل علی خاں لکھتے ہیں کہ اکثر جوانانِ رعنا سے محشور رہتے تھے۔[4] سعادت خاں ناصر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ انھیں تاباںؔ سے محبت تھی اور اس کے غم میں زار ونزار تھے۔ اور اس کی خاطر کبھی کبھی اردو میں شعر کہہ لیا کرتے تھے۔[5] بعض تذکرہ نگاروں نے محمد فقیہہ صاحب[6] دردمند اور انعام اللہ خاں یقین[7] سے مرزا کے تعلقات کو بھی

---

[1] جام جہاں نما (قلمی رامپور) ص ۴۳، ۷ [2] تذکرۃ الشعراء (قلمی رامپور) ص ۶۹۲ [3] معمولات مظہریہ ص ۷، [4] بستان خزاں (قلمی رامپور) [5] تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی) آزاد لائبریری علی گڑھ [6] مخزن نکات ص ۴۹ [7] گلشن سخن (قلمی علی گڑھ) ورق ۱۱۵، الف۔

اس رنگ میں پیش کیا ہے۔ خوش گو کو مرزا سے بہت محبت اور عقیدت ہے۔ وہ ان کی عشقیہ زندگی کا ایک واقعہ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ مرزا صاحب اور ان کے منظور نظر میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ مرزا صاحب چھ مہینے تک اس مسجد سے باہر نہیں نکلے جس میں ان کی اقامت گاہ تھی۔ اور اس مسجد میں انھوں نے اپنے لئے ایک قبر بنوائی تھی اور دن رات اس قبر میں پڑے رہتے۔ اور ہر وقت آہ و بکا کرتے، لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ مرزا صاحب کا انتقال ہو گیا[۵۱] مرزا صاحب کی حسن پرستی کو محمد حسین آزاد نے خاص انداز میں پیش کر کے خوب ہجو ملیح کی ہے۔

ان کے مریدوں میں بہت بڑی تعداد روہیلوں کی تھی۔[۵۲] یہ وہ لوگ تھے جو مغل حکومت کے لئے برابر خطرہ بنے ہوئے تھے۔ نجف خاں کے زمانے میں روہیلوں کا بہت زیادہ زور ہو گیا تھا۔ دلی کے اکثر گلی کوچوں میں آباد ہو گئے تھے۔ روہیلے چونکہ ابھی عیش و عشرت میں نہیں ڈوبے تھے اس لئے ان کے دست و بازو میں ابھی تک طاقت باقی تھی اور نجف خاں کو ہمیشہ ان سے خوف رہتا تھا۔ دلی میں روہیلوں کا سب سے بڑا مرکز مرزا کی خانقاہ تھی۔ اس لئے نجف خاں کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ مرزا کو قتل کرا دیتا۔ چنانچہ، محرم الحرام ۱۱۹۵ھ کو کچھ رات گزری تھی کہ کچھ لوگوں نے دستک دی۔ نوکر باہر آیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مرزا سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ نوکر نے مرزا کو اطلاع دی۔ مرزا خواب گاہ سے باہر آئے۔ ان میں سے ایک نوجوان جو مغل تھا آگے بڑھا اور اس نے پوچھا مرزا مظہر آپ ہی ہیں۔ مرزا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے

---

۵۱ سفینۂ خوش گو (قلمی) ورق ۱۸۸۔ الف و ب۔

۵۲ کلمات طیبات ص ۶۵

دوساتھیوں نے اس کی تصدیق کی۔ نوجوان نے ان پر طمنچہ کی گولی داغ دی۔ گولی سینے پر دائیں طرف دل کے قریب لگی۔ وہ زمین پر گر گئے[۵۱] اور قاتل فرار ہو گئے۔ مسلمان جرّاحوں نے بہت کچھ علاج کیا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ آخر تیسرے دن ۱۰ محرم الحرام کو مغرب کے وقت وفات کر گئے[۵۲]۔ ترکمان دروازے کے قریب ان کو دفن کیا گیا۔ یہ حویلی مرزا کی بیوی کی ملکیت تھی[۵۳]۔ بعد میں خانقاہ شاہ غلام علی کہلائی اور آج کل خانقاہ شاہ ابوالخیر کے نام سے مشہور رہے۔ مرزا کی قبر اب بھی سنگ مرمر کے ایک بہت خوبصورت مجر میں محفوظ ہے۔
لوح قبر پر مرزا کا یہ شعر کندہ ہے ؎

بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

اکثر معتقدوں، دوستوں اور ہم عمروں نے مرزا کی وفات کی تاریخیں کہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ میر قمر الدین نے حدیثِ نبوی سے تاریخِ وفات نکالی۔

عاشَ حمیداً ماتَ شہیداً

قاضی ثناءاللہ پانی پتی نے آیت شریف سے تاریخِ وفات نکالی۔

اُولٰئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ

۱۱۹۵ھ

---

[۵۱] قاتلانہ حملے کی پوری تفصیل شاہ غلام علی نے بیان کی ہے۔ مقاماتِ مظہری۔ ص ۶۱۔

[۵۲] مقامات مظہری ص ۶۱۔

[۵۳] مرزا نے اپنے وصیت نامہ میں اس حویلی کا ذکر کیا ہے۔ معمولاتِ مظہریہ

اکثر مؤرخین نے قتل کی وجہ اختلافِ مذہب بتائی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مرزا صاحب کو شیعہ گروہ کے آدمیوں نے مذہبی تعصب کی وجہ سے مارا ہے۔ خود نجف خاں بھی کٹر شیعہ تھا۔ کریم الدین علی لطف، قدرت اللہ قاسم وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے۔ کئی تذکرہ نگار اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ مرزا صاحب کے قتل میں نجف خاں کا ہاتھ تھا۔ تاریخ محمدی میں مرزا محمد حارثی کے کسی وارث نے ان کی وفات سے متعلق لکھا ہے کہ ۷ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ کو دہلی میں نجف خاں کے مغل ملازموں کے ہاتھ سے مرزا نے طمنچہ کی گولی کا زخم کھایا۔ صاحب تذکرہ عشقی نے مرزا کے قاتل کے متعلق یہی لکھا ہے کہ وہ نجف خاں کا ملازم تھا اور مذہبی تعصب کی وجہ سے انہیں قتل کیا گیا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب کے قتل میں سیاسی اور مذہبی دونوں اسباب کام کر رہے تھے۔ جن میں سیاسی اسباب کو اولیت خاص تھی۔ اور مذہب کو محض سیاسی اغراض کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔

مرزا صاحب اور تصوّف

ہندوستان میں تصوّف کی باقاعدہ داغ بیل چشتیہ سلسلے کے بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہاتھوں پڑی۔ جو پرتھوی راج کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ اگرچہ خواجہ صاحب سے پہلے بھی ہندوستان میں بہت سے بزرگ مگر تاریخ میں ان کے حالات پوری طرح روشن نہیں ہیں۔ خواجہ صاحب نے ہندوستان آکر اجمیر میں قیام کیا۔ جہاں تمام عمر رشد و ہدایت کا کام کرتے رہے۔ تصوّف کے ایک اور مشہور سلسلہ سہروردیہ کے ایک بزرگ حضرت شیخ بہاالدین زکریا بھی ہندوستان آئے اور انھوں نے ملتان اور سندھ کو اپنا مرکز بنایا۔ اسی زمانے میں ایک اور "فردوسیہ سلسلہ" قائم ہوا جسے حضرت شیخ بدر ا سمرقندیؒ نے ہندوستان میں جاری کیا۔ پندرھویں صدی کے وسط تک شاہ نعمت اللہ قادری قادری سلسلے کے اور شاہ عبداللہ شطاریؒ شطاریہ سلسلے کے بزرگ بھی ہندوستان آچکے تھے۔

اکبر کے عہد میں خواجہ باقی باللہؒ نے نقشبندیہ سلسلہ ہندوستان میں قائم کیا۔ یہی چند بڑے بڑے سلسلے ہیں جنھوں نے پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک تمام اقطاعِ ہند میں خانقاہی نظام کو منضبط اور منظم کرکے چلایا اور اپنے حلقۂ اثر میں اصلاح کی۔ آج بھی ہندوستان کی تمام معروف اور لائق ذکر خانقاہوں

کا سلسلہ انھیں سے ملتا ہے۔[1]

ہندوستان میں تصوف نے ایک عظیم تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی۔ صوفیا، ایک طرف حکمراں طبقے کے ظلم و استبداد کے خلاف جہاد کرتے تھے اور دوسری طرف بے بس لاچار اور مجبور انسانوں کو صبر و قناعت اور تسلیم و رضا نیز انسانی عظمت اور خودداری کا درس دے کر ان میں خود اعتمادی اور بلند کرداری پیدا کرتے تھے۔ یہ انھیں صوفیا کا فیض تھا کہ حکمراں طبقے کی گمراہیوں کے باوجود مذہبی عقائد میں ایسا زوال پیدا نہیں ہوا جو عام لوگوں کو اس سے منحرف کر دیتا یا حالات کا بہاؤ انھیں کسی اور طرف لے جاتا۔ وہ بناوٹ، تصنّع اور کٹھ ملاؤں کے ظاہری فریب سے بچ کر باطنی تربیت، تقویٰ، طہارتِ نفس کی تعلیم دینے لگے۔ یہ صوفیا اتباع سنّت پر زور دیتے اور اتباعِ شریعت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی نے ایک بار اپنے مرید کو تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"مسلکِ پیر حجت نمی شود۔ دلیل از کتاب وسنت می باید"۔

ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے:۔

"..... شیخ الاسلام نظام الدین در بیعت عام کشادہ بود و گناہ گاران را خرقہ و توبہ میداد و بارِ او خود قبول می کرد و خاصاً و عاما و غنیاً و مفلساً و مُلکاً و فقیراً و متعلماً و جاہلاً و غازیاً و مجاہداً و احرار و عبیداً و اطبۃً و توبہ و مسواک پاکی میفرمود و جماہیر طوائفہ مذکور از آں کہ خود را مرید شیخ میدانستند از بسیار نا کردہ دینہا دست می داشتند.........

---

[1] یہ تمام معلومات تاریخِ مشائخِ چشت سے حاصل کی گئی ہیں۔ ص ۱۲۳ - ۱۳۴۔

"......... مرد و زن و پیر و جوان و بازاری و عامی و غلام و چاکر و کودکان و خورد سال بہ نماز در آمدہ بودند - و اغلب و اکثر در آیندگان ارادت نماز چاشت و اشراق را لازم گشت ...... و کار مریدانِ قدیم جز طاعت و عبادات و ترک و تجرید و کتب سلوک خواندن و مآثر مشائخ و معاملات مشائخ و حکایت کردن کارے دیگر نہ بود ..... خواص و عوام نیکو کاری گرائیدہ و حاشا و کلا در چند سال آخر عہد علائی نام شراب و شاہد و فسق و فجور و قمار و فحش و لواطت و بچہ بازی بر زبانِ اکثر مردماں گذشتہ باشد"[1]

ظاہر ہے کہ تصوّف مردم بے زار نہیں تھا - اس میں انسان دوستی، زندگی کی قدروں پر ایمان، سچائی اور صداقت تھی - یہ سماجی اصلاح کی بہترین تحریک تھی - یہ کہنا بھی غلط ہے کہ یہ حضرات رہبانیت کے قائل تھے یا انھوں نے عوام کو ترکِ دنیا کی تعلیم دی - ان کا مقصد اصلاح یہ تھا کہ اخلاق کی تربیت کی جائے - اکل حلال حاصل کیا جائے اور لذّات دنیا سے کنارہ کش ہو کر کتاب و سنت کی پیروی میں ثابت قدم رہا جائے - یہ دنیا میں بہتر زندگی گزارنے کے وسائل تھے، ترکِ دنیا کے نہیں -

چنانچہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کہا کرتے تھے :-

"ترکِ دنیا آں نیست کہ کسے خود را برہنہ کند لنگوتہ بہ بندد و بہ نشیند ترک دنیا آں است کہ لباس بہ پوشد و طعام بخورد و اما آنچہ می رسد روا بدارد و بہ جمع او میل نہ کند و خاطر را متعلق چیزے نہ آورد ترکِ دنیا است"[2]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۳ - ۳۴۶ [2] فوائد الفواد صفحہ ۹ -

حضرت گیسو درازا اپنے مریدوں کو تعلیم دیتے تھے :۔

" دوستوں کی ضیافت فقیروں کو کھانا کھلانے سے بہتر ہے ۔ ہاں اگر کوئی صلہ رحمی ہو تو اس کا حصہ مقدم رکھنا چاہیئے "[1]

حضرت گیسو دراز نے کبھی اپنے مریدوں کو ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دی. دکن میں ان کے کچھ مرید شاہی ملازمت میں تھے ۔ حضرت گیسو دراز اپنے دو مریدوں ملک عزیز الدین اور ملک شہاب الدین کو خط میں لکھتے ہیں :۔

"......... در ہر کارے کہ ہستی باش ۔ باید کہ باخدا باش و بہ طلبِ مقصودِ خود باشی ۔ گفتہ اند ۔ بیت ؎

مراد اہلِ طریقت لباسِ ظاہر نیست

کمر بہ خدمتِ سلطاں بہ بند و صوفی باش

تراکہ چاکری سلطان و خدمتِ پدر ادائے فرقِ متعلقان زیاں کار نباشد ۔ تو باخدا و پیر متوجہ باشد ۔ ہر چہ بکنی بکنی ۔ مگر خلافِ شرع نہ کنی ۔"[2]

تصوف کو ہندوستان آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ بعض نااہل لوگوں کی بے اعتدالیوں نے انفرادیت کو فروغ دینا شروع کر دیا. مجہولیت، دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس. بے وجہ قناعت اور کلبیت و انفعالیت نے تصوف میں راہ پالی ۔ تصوف جس کا مقصد انسان دوستی تھا ۔ مردم بے زار ہو گیا ۔ قرآن و شرع، رسوماتِ مذہب اور سنت نبوی کو بے کار سمجھ کر وحدت الوجود کے فلسفے پر زور دیا جانے لگا ۔ اس طرح اسلام

---

[1] خاتمہ شریف۔ [2] مکتوبات گیسو دراز ص ۸ ۔

اور اسلامی تصوف کی صورت مسخ ہونے لگی۔ اور یہ وبا شاید اکبر کے زمانے میں انتہا کو پہنچ گئی۔

اکبر کی تحریک "دین الہٰی" اور مجدد الف ثانیؒ کی تحریک "اتباعِ سنّت" تقریباً ایک مخصوص حالت کے دو مختلف ردِ عمل ہیں۔ اگر ہم اکبر کے دور کے علماء اور صوفیاء کے حالات پر نظر ڈالیں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اکبر نے "دین الہٰی" کیوں ایجاد کیا تھا اور احیائے سنت کے لئے مجدد الف ثانی کیوں پیدا ہوئے۔

ابتداء میں اکبر مذہب اسلام کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ کمیڈی (KAMMADY) نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ۹۸۵ھ میں ابوتراب مکہ سے ایک پتھر لائے جس پر آنحضرتؐ کا نقشِ قدم بنایا جاتا تھا۔ اکبر شہر سے چار کوس دور استقبال کے لئے گیا اور حکم دیا کہ تمام امراء دربار باری باری اس پتھر کو لے چلیں۔

مگر بعد میں کچھ علماء کی بے دینی، عیاری اور مکاری، ہوس دولت وجاہ دیکھ کر اکبر ان سے متنفر ہوگیا۔ اس عہد کے علماء پر تبصرہ کرتے ہوئے مجدد الف ثانیؒ لکھتے ہیں:-

"عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است و بہ ظلمات بدعت آرام گرفتہ۔ کرا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند۔ و بہ احیائے سنت لب کشاید۔ اکثر علماء ایں وقت رواج دہندہائے بدعت اند و محو کنند ہائے سنت"[1]

---

[1] مکتوبات مجدد الف ثانیؒ۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۳۔

بعض مذہبی مسائل میں اکبر علماء دین کا مشورہ طلب کرتا تو ایک عالم ایک چیز جائز قرار دیتا اور دوسرا اس کو حرام۔ اکبر مخدوم الملک سید عبداللہ کی بہت عزت کرتا تھا۔ لیکن اس کی جاہ پرستی، دنیا داری اور غیر اسلامی حرکتوں نے اکبر کے بنیادی عقائد بدل دیے اور وہ اسلام سے متنفر ہوگیا۔ مخدوم الملک کے بارے میں ملّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:-

"چنداں خزائن ودفائن او پدید گشت۔ قفل آں را بکلید وہم نتواں کشاد۔ ازاں جملہ چند صندوق طلاء از گورخانہ مخدوم الملک کہ بہ بہانہ اموات دفن کردہ بود ظاہر شد۔"[1]

ان ہی حالات نے اکبر میں صداقت اور سچائی کی تلاش کا جذبہ پیدا کیا۔ اس نے ۱۵۷۵ء میں "عبادت خانہ" کے نام سے ایک عمارت بنوائی۔ اس کے چار حصے تھے۔ جس میں سید، علماء، فقہاء، شرفا اور امراء بیٹھتے تھے۔ مذہبی مسائل پر مجادلے اور مباحثے ہوتے۔ اکبر کافی عرصے تک ان سب کی بحث و تکرار سنتا رہا۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر شخص دلائل پیش کرنے کے بجائے جذباتیت، شور و غل اور غم و غصہ سے دوسرے کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مباحثے صداقت کی طرف رہنمائی کے بجائے ذہنی ورزشیں تھیں۔ خانقاہوں کی حالت دیکھ کر اکبر کو اور بھی مایوسی ہوئی۔ اہل طریقت کو اسلام سے دور کا واسطہ نہ تھا۔ "ہمہ اوست" کے فلسفے کا سہارا لے کر اہل خانقاہ مذہب کی ظاہری رسوم، پابندیٔ شرع اور اتباع سنت سے بالکل بے نیاز ہوگئے تھے خانقاہیں عیش و عشرت، آوارگی اور خلاف مذہب و اخلاق حرکتوں کی آماجگاہ

---

[1] منتخب التواریخ۔ ص ۳۱۱۔

بن گئی تھیں۔ اور اہل خانقاہ تنہاپسندی، مردم بیزاری اور کلبیت کا شکار ہو چکے تھے۔

اکبر نے دوسرے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ ملّا لکھتے ہیں:۔

"اصناف دانایان از ہر دیار در ارباب ادیان و مذاہب بہ دربار جمع شدند۔ بشرف ہم زبانی مخصوص بودند۔ بعد از تحقیق و تفتیش کہ شب و روز شیوہ پیشہ غیر ازاں نہ داشتند۔"[1]

اس تحقیق و تفتیش نے اکبر کے "دین الٰہی" کو جنم دیا اور یہ حالات تھے جنہوں نے اکبر کو ایک بہترین سیاست داں بنادیا۔

مجدد الف ثانیؒ کی تحریک بھی اسی کا ردِ عمل تھی۔ اس تحریک کو مختصر الفاظ میں "اتباع سنّت" اور "اجتناب عن البدعتہ" کہا جاسکتا ہے۔ وہ طریقت اور تصوف کے ان تمام فلسفوں کے خلاف تھے جن میں اشراقیت، ویدانت اور عیسائیت کے نظریات کام کر رہے تھے۔ اکبر نے بعض غیر شرعی چیزوں کو مثلاً جوا، شراب اور سور وغیرہ کو جائز قرار دے دیا تھا۔ مجدد الف ثانیؒ نے ان کی سختی سے مخالفت کی۔ جہانگیر کے دربار میں ان کے تعظیمی سجدے کا واقعہ مشہور رہے۔ جہانگیر نے ایک دفعہ انھیں دربار میں بلایا اور تعظیمی سجدے کے لیے کہا۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ جہانگیر نے یہ آہنی عزم کسی انسان میں نہیں دیکھا تھا۔ غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اور گرفتار کر کے قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا۔ مگر دو سال بعد انھیں رہا کر دیا گیا۔ مجدد الف ثانیؒ جب تک زندہ رہے قرآن اور اتباع سنّت کی تبلیغ کرتے رہے۔ وہ اپنے مسلک میں اتنے انتہاپسند ہو گئے کہ ان کے دل میں ہندوستان

---

[1] منتخب التواریخ۔ ص ۲۵۶۔

کے دوسرے مذاہب کا قطعی احترام نہیں رہا سو سال بعد یہی حال ان کے پیر د شاہ ولی اللہ کا تھا۔ مرزا مظہر اسی سلسلے سے بیعت تھے۔ مگر اس طریقے میں یہ ان کا اجتہاد ہے کہ وہ ہندوؤں کو مشرکانِ عرب کی طرح بت پرست نہیں مانتے تھے۔ وید، رام چندر اور کرشن جی کا احترام کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تناسخ کے مسئلہ پر یقین رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا۔

مجدد الف ثانیؒ کی یہ تحریک دراصل اورنگ زیب کے ہاتھوں پھلی پھولی۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر دربار میں جن غیر اسلامی رسومات کو دخل ہو گیا تھا عالمگیر نے انھیں ختم کر دیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی سنہ شمسی کو جو پارسیوں کی تقلید سے قائم کیا گیا تھا قمری سے بدل دیا۔ "درشن کا غیر اسلامی طریقہ بالکل بند کر دیا۔ لوگ دربار میں بادشاہ کی تعظیم کے خیال سے ایک دوسرے کو صرف ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتے تھے۔ اورنگ زیب نے سلام کا مسنون طریقہ رائج کیا اور حکم دیا کہ مسلمان عام طور پر سلام کا یہی طریقہ برتیں۔ اس نے سب سے اہم کام یہ کیا کہ علماء، و فضلاء، کو جمع کر کے تصنیف کا ایک محکمہ قائم کیا۔ اور کئی سال کی لگاتار کوششوں کے بعد فتاویٰ عالمگیری تیار کرائی۔[1] اورنگ زیب سے قبل مغل بادشاہ سکوں پر کلمہ کندہ کراتے تھے۔ اورنگ زیب نے اسے بند کرا دیا تاکہ کلمہ کی بے حرمتی نہ ہو۔ ۱۲ مئی ۱۶۵۹ء کو تمام صوبہ داروں کو ایک سرکلر بھیجا گیا جس میں سخت ہدایات دیں کہ ان کے علاقے میں بھنگ وغیرہ کی کاشت نہ کی جائے۔ اور حکم عدولی کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔[2] اورنگ زیب نے تمام پرانی مسجدوں کی

۱؎ عالمگیر سے متعلق تمام معلومات "مضامین عالمگیری" سے لی گئی ہیں۔ ص ۱۳۵۔ ۱۳۸۔

۲؎ تاریخ اورنگ زیب۔ سرکار۔ جلد سوم ص ۸۳۔ ۸۴۔

کی مرمت کرا کرا نھیں درست کروایا اور ان میں امام، مؤذن اور خطیب اور دوسرے ملازم رکھے جن کی تنخواہیں سرکاری خزانوں سے دی جاتی تھیں۔ لیکن اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی مجدّد تحریک کا اثر ختم ہونے لگا۔[۱]

چونکہ اس کی وفات کے بعد مغل حکومت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ بادشاہ امراء اور اہل سیف لاچار اور مجبور ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ اپنے بازوؤں اور تدبیروں سے زیادہ خانقاہوں میں کی جانے والی دعاؤں، تعویذوں اور ایسی ہی روحانی چیزوں پر یقین کرنے لگے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کی سیاست پر زوال آجانے کی وجہ سے اخلاقی اور مذہبی اقدار بھی زوال پذیر ہو گئی تھیں۔ مذہب ایک مضحکہ خیز چیز بن گئی تھی۔ خانقاہوں میں رہنے والے عیّار

---

[۱] دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا رمیں لکھا ہے:-

"............ بعد از دریافت حقیقت الحقائق و تحقیق رموز و دقائق مذہب برحق صوفیہ و فائز گشتن بایں عطیہ عظمیٰ درصدرِ آں شد کہ درکہ کند مشرب موحدان ہند۔ و بعضے از محققان ایں قوم و کاملان ایشان کہ بہ نہایت ریاضت و ادراک و فہمید گی و غایت تصوف و خدایابی رسیدہ بودند مکرر صحبتہا داشتند و گفتگو نمودند جز اختلاف لفظی در یافت و شناخت حق تفاوتے ندید۔" (سفینۃ الاولیاء ص ۸۰)

اورنگ زیب دراصل اس تحریک سے خالف تھا وہ جانتا تھا کہ ان صوفیوں کے ہاتھوں اسلام اپنی انفرادیت کھو کر ہندوستانی مذاہب میں ضم ہو جائے گا۔ اس نے سختی سے اس تحریک کو دبا دیا لیکن اس کی وفات کے بعد یہ تحریک پھر ابھری اور اس دفعہ بڑے کروفر کے ساتھ۔ کیونکہ تمام ترقی پسند قوتیں اس تحریک کے ساتھ تھیں۔

حرفِ اوّل

برصغیر پاک و ہند اس لحاظ سے ایک منفرد خطہ ہے، کہ جس دور میں اس خطے میں سیاسی، معاشی اور سماجی حوالے سے زوال شروع ہوا چند ایسے نفوس قدسیہ پیدا ہوئے جنہوں نے قومی سطح پر اس وسیع تباہی و بربادی کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور معروضی تقاضوں کے مطابق ایسی حکمت عملی ترتیب دی جو اس تباہی کا مقابلہ کر سکے، اور یوں انھوں نے اپنے فکر و عمل اور جہد و کردار سے خدا پرستی اور انسان دوستی کو صحیح خطوط پر فروغ دینے کی بھرپور سعی فرمائی۔

اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ہندوستان جس بُری طرح زوال پذیر ہُوا اور ہمہ جہتی تنزل شروع ہُوا وہ تاریخ کا ایک تلخ باب ہے۔ ایسے پُر آشوب دور میں جہاں حضرت الامام حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ ایسے عظیم سماجی اور سیاسی مفکر اور راہنما پیدا ہوئے، وہاں آپ کے ہم عصر لوگوں میں نقشبندیہ سلسلہ ہی کے فیض یافتہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایک مُسلّم حیثیت رکھتی ہے۔ خدائے عزوجل کی سچی محبّت کے جس حقیقی ذوق اور انسان دوستی پر مبنی جس قومی و سیاسی فکر کو حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ اور آپ کے نسبتی و روحانی خانوادہ نے فروغ دیا، حضرت مرزا مظہرؒ نے اسی مسلک و مشرب کو اپنے مخصوص انداز میں آگے بڑھایا، بالخصوص اس خطّے میں مختلف مذاہب کی موجودگی میں ہندوستان کی سیاسی وحدت کے لیئے جس مذہبی رواداری پر مبنی قومی سوچ اور اس کے شعور کی ضرورت تھی، حضرت مرزا صاحب شہیدؒ نے اسے پروان چڑھایا، چنانچہ مرزا صاحبؒ کے خطوط کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ دیگر مذاہب بالخصوص "ویدک دھرم" کے بارے میں آپ کی سوچ انتہائی متوازن حقائق پر مبنی اور قومی تقاضے کی حامل نظر آتی ہے اور ہندوستان کے معروضی تقاضوں کے تناظر میں دور کی حقیقی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ حضرت مرزا صاحب ان حضرات اولیاء اللہ میں سے تھے جو اس خطے کے سیاسی تقاضوں کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے اور اس پس منظر میں بہترین سیاسی شعور اور قومی سوچ کے حامل تھے۔ چنانچہ ایک خط میں اپنی ان صلاحیتوں کے بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں۔

"اگر نواب، ہمارا سلیقہ اور تدبیر چاہتا ہے اور ہماری سلامتِ عقل پر بھروسہ کرتا ہے، اور اچھی بُری باتوں میں ہم سے مشورہ لیتا ہے، تو مخلوق خدا کے فائدے کے لیئے پُوری توجہ اور مفید تدابیر (اور حکمت عملی) کو ہم کام میں لائیں گے۔"

قومی اور سیاسی حوالے سے ہی نہیں، تصوف و احسان کے حوالے سے بھی آپ بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں،

ایسے زوال پذیر معاشرے میں جہاں قومی تقاضوں سے کٹ کر، طریقت کو چند بے جان رسومات کا مجموعہ سمجھ لیا گیا تھا، اور اس کے پردے میں وہ تمام خرابیاں جو زوال سے دوچار ہونے والے معاشروں کا حصّہ ہوتی ہیں تصوّف کے نام پر جاری تھیں، ان نقشبندی بزرگوں نے اپنے سعی و عمل سے تصوف و احسان کو خدا کی سچی محبّت کے حوالے سے ایک ایسی روح پرور قوت اور طاقت میں تبدیل کر دیا جو قومی آزادی کے حصول کے لئے بہت ضروری تھی۔ اور ہندوستان میں زوال سے نکلنے کے لئے ایک زوردار تحریک پیدا کرنے کا سبب بنا تاریخ شاہد ہے کہ ان حضرات نے اپنے کردار سے تصوف و احسان کو اس خطّے میں ایک ایسی طاقت، ہمت اور قوّت کا نام بنا دیا جس کی توانائی پا کر زوال سے نکلنے کی تحریک پیدا ہونا یقینی امر ہو گیا۔

اس حوالے سے حضرت مرزا مظہر شہید رحمۃ اللہ علیہ کا مقام اور مرتبہ بیان فرماتے ہوئے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی تحریر فرماتے ہیں۔

"ان کا مرتبہ میں اچھی طرح جانتا ہوں، تمہیں ان کے بارے میں کیا معلوم ہے؟ ہندوستان کے لوگوں کے حالات مجھ سے مخفی نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ فقیر کا وطن ہے، عرب ممالک کے حالات کا بھی میں نے اچھی طرح مشاہدہ کیا ہے، اور انگریز ممالک اور وہاں کے لوگوں کے حالات بھی مجھے ثقہ آدمیوں سے معلوم ہوئے ہیں۔ میری تحقیق یہ ہے کہ وہ (مرزا مظہرؒ) شریعت و طریقت کے صحیح راستہ پر ہیں، اور کتاب و سنت پر کمال استقامت سے عمل پیرا ہیں، اور طالبانِ فکر و شعور کی راہنمائی میں بڑی عظیم الشان اور مضبوط دل و دماغ رکھتے ہیں، اس زمانے میں ان جیسا آدمی بڑے بڑے شہروں میں بھی موجود نہیں ہے" (کلمات طیبات ص۲۰)

جناب خلیق انجم صاحب نے مرزا مظہرؒ کے خطوط کا ترجمہ کیا اور ان کی ترتیب جدید قائم کی ہے۔ تاکہ اردو دان حضرات ان سے مستفید ہو سکیں اور شروع میں آپ کے حالات زندگی پر ایک تحریر لکھی، اگرچہ اس میں عامیانہ انداز اپنایا گیا ہے اور بعض مقامات پر مرزا صاحب کے حالات کو صحیح تناظر میں نہیں سمجھا گیا۔ تاہم اس سے آپ کے سوانح کا اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

ملی دار الکتب کے منتظم جناب مولانا محمد عباس شاد اس حوالے سے ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ یہ اولیاء اللہ اور بزرگان اُمّت کی وقیع تحریرات وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہتے ہیں، مرزا مظہرؒ کے ان خطوط کی طباعت و اشاعت کا کام بھی انہوں نے بڑی دلجمعی اور پوری تندھی سے کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور ہمیں بزرگانِ اُمّت کی تحریرات سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

کتبہٗ : عبد الخالق آزاد

ریلوے مسجد - ہارون آباد

اور مکار صوفیوں کی پورے سماج پر گرفت بہت مضبوط ہوگئی تھی اور محمد شاہ کا زمانہ تو اس سلسلے میں یادگار ہے۔ اس زمانے کے متعلق مرزا حیرت یہ لکھتے ہیں:

"(محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ) انتہا درجہ کا ملکی اور مذہبی پہلو سے تاریک ترا اور ناپاک تھا۔ شریعتِ محمدی پر مضحکہ خیز نکتہ چینیاں عین دربار میں ہوتی تھیں۔ اور مے نوشی کی لذتوں اور سرخوشانہ اور بے خودانہ حالتوں کے آگے حدیث نبوی پر قہقہے اڑائے جاتے تھے .... محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں جس تصوف نے رنگ جمایا تھا وہ اسلامی توہین کا اپنے میں بڑا مادّہ رکھتا تھا۔ امرد پرستی اور ناپاک عشق کا صوفیوں کی مجلس میں عروج ہوا۔

.... محمد شاہ کے زمانے میں اس جھوٹے تصوف اور قابلِ نفرت صوفیوں کو جس قدر عروج ہوا وہ تاریخ میں ایک نامور زمانہ ہے۔ اکثر عظیم الشان جلسوں میں اللہ ہو کی صدائیں اور جھوٹے صوفیوں کے چٹخاروں کی آوازیں بلند ہوتی ہوئی سنائی دیتی تھیں اور انمیں وہ خرافات باتیں ہوتی تھیں کہ جو قابلِ بیان نہیں"[۵۱]

تقریباً یہی زمانہ ہے جس میں مرزا مظہر نے ہوش سنبھالا اور اپنی باطنی تربیت مکمل کرکے رُشد و ہدایت کی طرف متوجہ ہوئے۔ حالانکہ بادشاہوں اور امراء کی سرپرستی نے ایسے صوفیاء کی بہت ہمت افزائی کی تھی جن کی زندگی کا مقصد صرف سماجی عزت و وقار اور دولت حاصل کرنا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور میں

---

[۵۱] حیاتِ طیبہ ص ۷-۹۔

چند برگزیدہ شخصیتوں کو چھوڑ کر تمام صوفی "نمود و نمود" تھے جس نے عیاری اور مکاری سے لاکھوں روپیہ جمع کیا تھا۔ ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی جسے وہ الہامی کہتا تھا۔

ہر طرف انحطاط اور زوال کا بازار گرم تھا۔ بادشاہ اور امراء اور روساء سے لے کر عوام تک سب عیش و عشرت میں مبتلا تھے۔ ایک سماج کے شکست و ریخت کے نمایاں آثار دکھائی دے رہے تھے۔ تصوّف محض افیون بن کر رہ گیا تھا جس سے غرض نشاط نہیں "بلکہ" اک گونہ بے خودی تھی۔

اس عہد کو پھر سے ایک مجدد الف ثانیؒ کی ضرورت تھی۔ مگر اس دفعہ ایک نہیں کئی مجدد پیدا ہوئے۔ شاہ ولی اللہؒ[1] مولانا فخر الدینؒ[2] اور خواجہ میر دردؒ

---

[1] شاہ ولی اللہؒ کی ولادت ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۱ء) میں ہوئی۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم کی علمیت اور قابلیت۔ پاک بازی اور صداقت کی دھاک پورے ہندوستان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب اورنگ زیب نے "فتاویٰ عالمگیری" مرتب کرانے کے ارادے سے ایک شعبۂ تالیف کھولا تو انھیں اس شعبے کا سرپرست مقرر کیا۔ شاہ ولی اللہؒ بھی مجدد تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے مرزا مظہرؒ کی طرح مجدد تحریک کی مردہ رگوں میں ایک بار خون دے کر اُسے زندہ کیا۔ ان کی تعلیم بھی صرف اِتّباع سُنّت تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں تمام بزرگوں سے بازی لے گئے۔ خود ان کے زمانے اور بعد میں بھی اُن کی جو قدر و منزلت پورے ہندوستان میں رہی ہے وہ ان کے ہم عصروں میں کسی کو بھی نصیب نہ ہو سکی انھوں نے اپنی پوری زندگی محض اس مقصد پر قربان کر دی کہ اسلام کو ان غلط اثرات اور مولویوں سے محفوظ کیا جائے جو اس عظیم الشان درخت کی جڑوں پر کلہاڑی مار رہے تھے۔ (باقی صہ ۳۲ پر)

اور مرزا مظہر۔ ان سب بزرگوں نے پھر مجدّد تحریک کا احیا کیا۔ ان سب میں کچھ اختلافات ضرور تھے مگر بنیادی عقائد ایک ہی تھے یعنی قرآن اور سنّتِ نبوی کی تبلیغ۔"

مرزا صاحب اتباعِ کتاب وسنّت میں اس قدر سخت تھے کہ ایک دفعہ ان کے والد انھیں اپنے پیر ومرشد شاہ عبدالرحمٰن قادری کی خدمت میں لے گئے۔ اتفاق سے سکر وسماع کی حالت میں شاہ عبدالرحمٰن عصر اور مغرب کی نماز نہیں پڑھ سکے۔ انھوں نے یہ حالت دیکھ کر دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر والد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو کہا تو وہ انکار کر دیں گے۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۳) وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے قرآن شریف کا فارسی ترجمہ کیا۔ اور تصوف کے مسائل کو اس انداز میں پیش کیا کہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد اور ہندوستانی تصوّف کے فلسفوں میں کوئی تفریق باقی نہیں رہی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ شاہ صاحب اپنے مسلک اتّباعِ سُنّت میں بہت زیادہ انتہا پسند ہو گئے تھے اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب کی ان کے دل میں کوئی قدر ومنزلت نہیں تھی۔ ۱۱۷۶ھ ہجری (۱۷۶۲ء) میں شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" از مولانا عبیداللہ سندھی۔ "شاہ ولی اللہ" از مناظر احسن گیلانی۔ ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیزؒ۔ "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات"۔

۵۲ شاہ فخرالدین کی ولادت ۱۱۲۶ھ میں اورنگ آباد میں ہوئی۔ ان کے والد شاہ نظام چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ شاہ کلیم اللہؒ کے مرید تھے۔ اور شاہ کلیم اللہؒ ہی نے شاہ نظام کو تبلیغ کے لئے دکن بھیجا تھا جہاں انھوں نے مستقل سکونت

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳ پر)

مگر خیریت گزری والد نے کچھ نہیں کہا۔

مرزا صاحب کی پوری زندگی سنّت نبوی کی ایک زندہ مثال تھی۔ سلام کرنے میں بھی وہ سنّتِ رسول کا خیال کرتے تھے اور بقول شاہ غلام علی

" مردم را باادب سلام موافقِ سنّتِ رسول خدا تاکید می نمودند وازدست

(بقیہ حاشیہ ص۷۲) اختیار کرلی۔ فخر الدین نام شاہ کلیم اللہ ہی کا تجویز کیا ہوا ہے۔ شاہ فخر الدّین بچپن ہی میں اپنے والد سے بیعت ہوگئے تھے۔ ظاہری تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد شاہ فخر الدّین نے لشکر میں ملازمت کرلی۔ چونکہ ان کی پرورش صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی اس لئے دن بھر فوجی کاموں میں مصروف رہتے اور رات کو خدا کی عبادت کرتے۔ مگر بہت جلد ان کی طبیعت فوجی کاموں سے گھبرا گئی اور اورنگ آباد میں اپنے والد کے سجادہ نشین ہوگئے ۱۱۶۰ھ یا ۱۱۶۵ھ میں دہلی آگئے اور یہاں درس و تدریس کا کام شروع کردیا۔ شاہ فخر الدّین کا مدرسہ دہلی میں بہت مشہور و معروف تھا اور تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر غازی الدّین خاں فیروز جنگ کا بنوایا ہوا تھا۔ شاہ فخر الدّین کا شمار بھی ان مصلحین قوم میں ہے جنہوں نے عوام کو تصوف کی بے راہ روی سے نجات دلائی۔ شاہ ولی اللہؒ اور مرزا مظہرؒ کی طرح وہ بھی " ہر چھوٹی بڑی" بات میں اتّباع سنّت کرتے۔ لوگوں کو بھی اس امر کی بڑی تاکید کرتے "۔ نماز روزے اور مذہب کی ظاہری رسوم کی بڑی سخت پابندی کرتے۔ غالبؔ کے دوست کالے صاحب غلام قطب الدین کے صاحبزادے اور شاہ فخر الدّین کے پوتے تھے۔ تاریخ مشائخ چشت۔ ص ۵۲۰، ۵۲۹۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مناقبِ فخریہ (قلمی) نظام الملک آصفیہ لائبریری حیدرآباد۔ فواعد فخریہ (قلمی) عیوض علی مملوکہ حسن ثانی صاحب نظامی (باقی صفحہ ۷۴ پر)

بر سر داشتن وخم شدن منع می فرمودند"۔[1]

مرزا صاحب روزے نماز کے اتنے پابند تھے کہ مرتے وقت نماز کی ادائیگی کے لئے پریشان رہے۔ وفات کے وقت شاہ غلام علی ان کے پاس تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"از نہایت ضعف آواز مبارک شنیدہ نمی شدہ روز صوم روز جمعہ بعد نماز صبح از بندہ پرسیدند کہ یازدہ نماز از و قضا شدہ وتمام بدن خون آلودہ است۔ طاقت بر داشتن سر نباشد۔ نماز موقوف باید داشت دبہ اشارۂ ابرو ادا کند، شما درین مسئلہ چہ معلوم است۔ عرض نمودم مسئلہ آن است کہ حضرت ایشاں فرمودند۔ بعد از گذاشتن نیم روز ہر دو دست بر داشتہ تا دیرے فاتحہ خواندند۔"[2]

وہ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے:

"ایمان مجمل کہ ایمان آوردم بخدا و رسولِ خدا و آنچہ پیغمبر از خدا آوردہ است۔ دوست دارم دوستانِ خدا و رسول را۔ و بیزارم از دشمنانِ خدا و رسول۔ بہ جہتِ نجات کافیست۔"[3]

مرزا صاحب کو بحیثیتِ صوفی بہت زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں ان کے مرید موجود تھے۔ لوگ دور دور سے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے آتے تھے۔ انھیں اپنے مریدوں کے اصرار پر اکثر دلی سے باہر جانا

(بقیہ حاشیہ ص ۷۳) فخر الطالبین، سید نور الدین حسین (قلمی) مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ آثار الصنادید، سر سید۔ باب چہارم۔ ص ۳۰۔ ۳۵۔

[1] مقاماتِ مظہری ص ۶۱۔ [2] ایضاً ص ۶۱۔

[3] مقاماتِ مظہری ص ۳۶۔

پڑتا تھا ۔ شاید جتنے روہیلے ان کے مرید تھے کسی اور کے نہیں تھے ۔
شاہ ولی اللہؒ جیسے مجتہد العصر اور عظیم المرتبت انسان مرزا صاحب کی عظمت کے قائل تھے ۔ ان کی نظر میں مرزا صاحب کی کس قدر وقعت اور عزت تھی اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ ایک خط میں مرزا کو القاب لکھتے ہیں :۔

"بنام مرزا صاحب خدائے عزوجل آں قیم طریقۂ احمدیہ وداعی سنّتِ نبویہ را ہرگاہ داشتہ مسلمین را متمتع و مستفید گرداند۔"[۱]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں ۔

"مرزا صاحب متع اللہ المسلمین بافادات قیم الطریقۃ الاحمدیہ وروئے ریاض الطریقہ بتوجہات النفس الزکیۃ ۔ آمین ۔"[۲]

شاہ ولی اللہؒ نے ان کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :۔

"آنچہ قدر ایشاں با مردم می دانیم شما چہ دانید ۔ احوالِ مردم ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشاءِ فقیر است ۔ و بلادِ عرب را نیز دیدہ ام و سیر نمودہ ۔ احوالِ مردم ولایت او ثقات آں جا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ کہ عزیزے بر جادہ شریعت و طریقت و اتباع کتب و سنّت ہم چنیں استوار مستقیم باشد و در ارشادِ طالبان شانے عظیم و نفسِ قوی دارد ۔ دریں جز زمان مثل ایشاں در بلاد عظیم دریافت نمی شنود مگر در گذشتگان بلکہ در ہر جز زمان وجود

خواجہ میر دردؔ بھی ان کے معترف تھے ۔ وہ کہا کرتے تھے ۔

[۱،۲] کلمات طیبات ص ۱۶۶ ۔ ۱۶۷

[۳] کلمات طیّبات ص ۲۰۰ ۔

"ہر کہ را از اصحاب ایشاں می بینم از یں عزیزان بہرہ یاب است۔ امّا درجات و حالات و مقامات تفاوت دارند"۔

انھوں نے اپنی متصوفانہ زندگی میں وہ مقام حاصل کرلیا تھا کہ بقول اُن کے:۔

روزے حضرت سید (نور محمد بدایونی) کفش بندہ درست کردہ نہادند۔ فرمودند شمارا بجناب الہٰی قبول تمام است۔"[1]

مرزا اپنے ایک اور استاد حاجی محمد افضل کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

حضرت حاجی محمد افضل بہ تعظیم بندہ راست می ایستادند کہ تعظیم کمالات نسبت شما میکنم۔"[2]

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے ہندوستان میں اسلامی سماج کی کشتی کو طوفان سے بچایا اور پوری زندگی کی قربانی دے کر مذہبی اور اخلاقی اقدار کی حفاظت کی ان میں مرزا صاحب کا نام سرفہرست ہے۔

---

[1] مقامات مظہری ص ۲۹ [2] ایضاً۔

مرزا صاحب کے خطوط

خطوط اپنے لکھنے والے کی شخصیت و سیرت اور اس کے زمانے کے سیاسی، سماجی اور تاریخی عوامل کا بہترین آئینہ ہوتے ہیں۔ کسی انسان کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ خطوط کے بعد سوانح عمری کا درجہ ہے۔ لیکن عام طور پر سوانح لکھتے ہوئے انسان حق و صداقت سے کام نہیں لیتا۔ اور حقیقت پردوں میں چھپی رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا محض اس لئے ہوتا ہے کہ سوانح نگار دروغ گوئی پر مجبور ہوتا ہے، یا ارادتاً حقائق کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اور بعض اوقات خود اسے بھی اس کا علم نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے اور لکھ رہا ہے اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس خطوط نویسی میں دروغ گوئی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں کیوں کہ شاذ و نادر ہی مکتوب نگار کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کے خطوط صرف مکتوب الیہ ہی نہیں ہزاروں اور لاکھوں لوگ پڑھیں گے۔ اس لئے وہ اپنی زندگی کے روزمرہ کے واقعات بے کم و کاست اور انتہائی بے تکلفی سے بیان کر دیتا ہے۔ اور خطوط میں بیان کی ہوئی یہ بہت سی چھوٹی بڑی باتیں حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ اور اس کے ذہن کو سمجھنے میں ہماری ممد و معاون ہوتی ہیں۔

اگر کوئی صنفِ ادب فنِ تاریخ سے بہت قریب ہے تو وہ خطوط نویسی ہے۔ مؤرخ کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے جو ہر واقعہ کو ایک مخصوص عینک سے دیکھنے پر مجبور

ہوتا ہے ۔ اس کو حاکم وقت کا خوف ہوتا ہے ۔ کبھی ایک مخصوص مذہب یا سیاسی جماعت کی طرف داری منظور ہوتی ہے، اس لئے اکثر وہ حقائق کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ واقعات کی شکل و صورت بالکل بدل جاتی ہے ۔ خطوط میں انسان اپنے چہرے پر کتنا ہی دبیز نقاب کیوں نہ ڈال لے پھر بھی حقیقت کی تلاش زیادہ مشکل نہیں ہوتی اور مکتوب نگار کی کوششوں کے باوجود اس کے ذہن کے تمام گوشے روشنی میں آجاتے ہیں ۔

ہندوستان میں صدیوں قبل فارسی مکتوب نگاری نے باقاعدہ فن کی صورت اختیار کرلی تھی ۔ آج بھی ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فارسی خطوط کے سیکڑوں مجموعے مل جاتے ہیں ۔ جن میں خسرو کی رسائل الاعجاز، محمود گاواں کی ریاضی الانشاء، چندربھان برہمن کی انشائے برہمن، ابوالفضل، فیضی ظہوری، عالمگیر، نعمت خاں عالی اور بیدل وغیرہ کے رقعات قابل ذکر ہیں ۔ ان کتابوں میں بعض مکتوبات کے مجموعے ہیں ۔ بعض میں انشاء پردازی کے اصول و قواعد بھی بیان کئے گئے ہیں ۔

مرزا صاحب رشد و ہدایت کے کام میں اس طرح مصروف رہے کہ انھیں زندگی بھر تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں مل سکی اسی لئے ان کا سرمایۂ تصانیف بہت مختصر ہے ۔ انھوں نے خود ۱۱۷۰ھ میں بیس ہزار اشعار میں سے تقریباً ایک ہزار کا انتخاب کر کے دیوان مرتب کیا تھا ۔ اور اس دیوان کا دیباچہ بھی خود ہی لکھا، جس سے دو اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے ۔ ایک تو یہ کہ مرزا صاحب نے شعر و شاعری میں دلچسپی صرف "ہنگام جوانی" میں لی تھی اور آخری عمر میں یہ مشغلہ ترک کر دیا تھا ۔ دوسرے ۱۱۵۰ھ میں مرزا صاحب کا ایک دیوان مرتب ہوا تھا ۔ اور اس پر بھی مرزا صاحب نے مقدمہ لکھا

تھا۔ مگر وہ دیوان اب نایاب ہے۔ مرزا صاحب کا فارسی دیوان شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے فارسی اشعار کی ایک بیاض "خریطۂ جواہر" کے نام سے مرتب کی تھی۔ یہ بیاض بھی شائع ہو چکی ہے اگرچہ اردو شاعری میں مرزا صاحب کی وہی اہمیت ہے جو فلسفہ میں ارسطو یا افلاطون کی ہے۔ لیکن انھوں نے اردو شاعری کو ہمیشہ "خلافِ ذئی" اور "دونِ مرتبہ" سمجھا۔ اس لئے کبھی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ مختلف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں اور بیاضوں میں ان کا اردو کلام بکھرا ہوا ہے۔ میں نے ان کے تمام اردو اشعار یک جا کر دیے ہیں جو میرے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے مقالے "مرزا مظہر جانجاناں:۔ ان کا عہد اور شاعری" میں شامل ہیں[۱] فارسی و اردو نثر میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ صرف فارسی خطوط ہیں۔ اپنے خطوط کے بارے میں انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے:۔

"دلبستان تحقیق کے اس بے سواد میں کتاب کی تصنیف کی استعداد نہیں ہے۔ دوستوں نے بعض شریعت اور طریقت کے مسائل پوچھے تھے ان کے جواب مکاتیب کے طور پر لکھے ہیں عزیزوں نے ان کو فراہم کیا ہے۔"

(تینتالیسواں خط)

آزاد لائبریری علی گڑھ میں رقعاتِ مرزا مظہر کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں صرف ۲۳ خطوط ہیں۔ یہی ۲۳ خطوط شاہ غلام علی کی مقاماتِ مظہری[۲]

---

[۱] عبدالرزاق قریشی نے "مرزا مظہر جانجاناں" میں مرزا کے اشعار مرتب کئے ہیں۔

[۲] مقاماتِ مظہری کا اردو ترجمہ ۱۹۱۵ء میں کتب قومی منزل نقشبندیہ (باقی صفحہ ۸۰ پر)

میں بھی شامل ہیں۔ غالباً مرزا صاحب کے رقعات کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو مرتب ہوا۔ بعد میں ان میں اضافے ہوتے رہے۔ کلمات طیبات میں حضرت غوث الثقلین، مرزا صاحب، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور شاہ غلام علی کے مکتوبات ہیں۔ مرزا صاحب کے مکتوبات کی تعداد ۸۸ ہے۔ کلماتِ طیبات کے آخر میں حضرت شیخ شہاب الدّین سہروردیؒ کے ایک رسالے اسرار العارفین کا فارسی ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء) میں مطبع العلوم مراد آباد سے محمد امجد علی مالک اخبار "نیّرِ اعظم" کے زیرِ اہتمام "۶ ۱/۴ اور ۱۰" کے سائز پر شائع ہوئی۔ مولوی حافظ علی مراد آبادی اس کے مرتب اور مولوی قمر الدین مراد آبادی اور مولوی صدیق حسن سنبھلی نے اس کی تصحیح کی اور حاشیے لکھے۔ اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۱ء) میں پھر اسی مطبع سے شائع ہوا۔ اس دفعہ مولوی قمر الدین کے ساتھ جو مولوی صدیق حسن کا نام تھا وہ نکال دیا گیا۔ پہلے ایڈیشن میں منشی انوار حسین تسلیمؔ کی تقریظ شامل ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ تقریظ بھی نکال دی گئی اور سائز بھی بدل کر "۶ ۱/۴ × ۹ ۱/۴" کر دیا گیا۔ عبدالرزاق قریشی صاحب نے ایک اور ایڈیشن کا ذکر کیا ہے۔ جو میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ ایڈیشن ۱۳۰۹ھ میں مجتبائی پریس دہلی سے حافظ محمد عبداللہ کے زیرِ اہتمام چھپا تھا۔ اور مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے اس کی تصحیح کی تھی۔[۲]

مرزا کے خطوط کا ایک اہم نسخہ "رقعات کرامت سعادت شمس الدین

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹) کشمیری بازار لاہور سے چھپا تھا جس پر مترجم کا نام نہیں تھا۔

[۱] مرزا مظہر جانجاناں ص ۲۴۸۔

حبیب اللہ مرزا جانجاناں مظہر شہید رضی اللہ عنہ" کے نام سے مطبع فتح الاخبار کول سے زیر اہتمام محمد عثمان خاں چھپا تھا۔ اس کا سنہ طباعت ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) ہے۔ اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں کل ۶۳ خطوط ہیں۔ جن میں دو بالکل نئے ہیں، جو اس ترجمے میں سب سے آخر میں شامل کئے گئے ہیں۔ ہر خط پر مکتوب الیہ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ میں نے اس ترجمہ میں مکتوب الیہم کے نام اسی نسخے سے لئے ہیں۔ یہ نسخہ نیشنل میوزیم نئی دہلی کی ملکیت ہے۔ میں نیشنل میوزیم اور خاص طور پر یوسف بخاری صاحب اور اقبال صاحب کا شکر گزار ہوں جن کی عنایات شاملِ حال رہیں۔

جاگیرداری دور میں زندگی کے ہر شعبہ میں تکلف، تصنّع اور مبالغہ آرائی ہوتی ہے۔ اس کا لازمی اثر خطوط نویسی پر بھی پڑتا تھا۔ مرزا مظہر کے دور میں فارسی خطوط میں رنگینیٔ عبارت، دور از قیاس تشبیہات اور استعارات اور تکلف اور تصنّع ہوتا تھا۔ اور عبارت اتنی مقفیٰ اور مسجع ہوتی تھی کہ اکثر و بیشتر مطالب خبط ہو جاتے تھے۔ اردو شاعری میں مرزا صاحب کو "نقاش اول ریختہ" اس لئے نہیں کہا گیا کہ انھوں نے شمالی ہند میں پہلی بار اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ بلکہ یہ اعزاز اس لئے ملا ہے کہ انھوں نے ایہام جیسے "سم" اور غیر فطری چیز کے خلاف پہلی بار آواز بلند کی اور اپنی اس مخالف آواز کو باقاعدہ تحریک کی صورت دی۔ انھوں نے اردو شاعری کی ان تاریک راہوں کو روشن اور منور کیا ہے جن پر گامزن ہو کر دردؔ، میرؔ، سوداؔ، آتشؔ، اور غالبؔ جیسے عظیم شاعروں نے نئی راہیں اور نئے راستے نکالے۔ اسی طرح مرزا صاحب نے فارسی مکتوب نگاری میں بھی سادہ گوئی

کی بنیاد رکھی اور اس کی اصلاح کرنی چاہی۔ غالبؔ نے اردو مکتوب نگاری میں جو اصلاحیں کی تھیں اور جس سادگی اور بے تکلفی کی طرح ڈالی تھی اس کی ابتدار ستّر اسّی سال قبل مرزا صاحب نے ہی کی تھی۔ مرزا مظہر خواہ مخواہ کے طویل اور پر تکلّف اور مبالغہ آمیز القابات کے خلاف تھے۔ وہ خود بھی سیدھے سادے القاب لکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ وہ مخدوما جانِ من، برادرِ من جیسے القاب استعمال کرتے تھے۔ وہ خط کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔ "بعد حمد و صلوٰۃ از فقیر مولوی صاحب مہربانی سلمہ الرحمٰن مطالعہ فرمانید" اور کبھی صرف "بعد حمد و صلوٰۃ" یا "حامداً و مصلیاً" یا باعثِ تحریر آنکہ" سے خط شروع کرتے۔

مرزا صاحب بہت سادہ القاب لکھ کر فوراً مطلب کی بات پر آجاتے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بہت زیادہ ہے جس میں مرزا بغیر کسی القاب یا توطیہ و تمہید کے مطلب کی بات کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ خود اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بھی اس کی تاکید کرتے ہیں۔ میر اجبنی کے نام ایک خط میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔

"معلوم ہے کہ بھائی اپنے ہاتھ سے خط نہیں لکھتے۔ جو لکھتا ہے اس سے کہہ دیں کہ یہ گھسا پٹا لقب (حقائق و معارف آگاہ) چھوڑ دے کیونکہ ہمارے اور تمہارے تعلقات میں ان الفاظ کی گنجائش نہیں ہے۔ اور وہاں کے لوگوں کا سلیقہ تحریر معلوم ہے۔ بے مزہ تکلّف کو دخل نہ دیں۔ اس کے بعد اس طرح لکھیں کہ میر اجبنی کی طرف سے مرزا جانجاناں مطالعہ کریں۔ اس کے بعد مطلب لکھیں۔"

(سینتا۴۴لیسواں خط)

میر صاحب نے غالباً مرزا صاحب کو پر تکلف القاب لکھا تھا۔ مرزا صاحب ان کو لکھتے ہیں:۔

"امید ہے کہ مراسلات اور مخاطبات میں پرانی رسم کے مطابق "مرزا صاحب" پر اکتفا کریں گے"۔

مرزا صاحب خط کے مضمون میں بھی سادگیٔ بیان کا پورا التزام کرتے ہیں۔ اکثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامنے بیٹھے ہوئے کسی انسان سے مخاطب ہیں۔ ان کے انداز تحریر میں وہ ہی بے تکلفی اور بے ساختگی ہوتی ہے جو صرف گفتگو میں ممکن ہے۔ غالبؔ کی خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے اس وقت اردو مکتوب نگاری کی اصلاح کی جب فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کی نثر نے غالب کے لئے میدان ہموار کر دیا تھا۔ اور عوام کا ذہن اس اصلاح کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ لیکن مرزا صاحب کی وہی قسمت تھی جو محمد شاہ تغلق کی تھی یعنی وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ جب انھوں نے فارسی مکتوب نگاری میں مشکل پسندی، نکتہ آفرینی، دقتِ مضامین اور تکلف و تصنع کے خلاف آواز بلند کی اور خود ایسی فارسی نثر کے نمونے پیش کئے جن میں سادگی، صفائی، سلاست و فصاحت، بے تکلفی، بے ساختگی شیرینی اور روز مرہ کا لطف تھا تو وہ فارسی داں طبقہ جس کا مزاج دربار اور امراء و رؤسا کی مصاحبت میں بنا تھا اسے قبول نہ کر سکا۔

مواد کے اعتبار سے بھی ان خطوط کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ بعض خطوط میں مرزا صاحب نے تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ خاص طور پر ابتدائی ۲۳ خطوط اس سلسلے میں بہت اہم ہیں۔ پہلے خط میں اپنا حسب و نسب اور مختصر سے خاندانی حالات بیان کئے ہیں۔ باقی خطوط میں

مریدوں اور معتقدوں کے شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ یہ خطوط مرزا کے مسلک، ان کے عقائد اور نظریات کو سمجھنے کا بہترین اور واحد ذریعہ ہیں۔ ان ہی خطوط میں تصوف کے اہم ترین مسائل "جبر و اختیار، سماع، کرامات و خرقِ عادات، وحدت وجود، نسبت، علم حضوری و حصولی، اتباع سنت اور ذکرِ جہر" وغیرہ جیسے اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے عقائد کے سلسلے میں جو چیز ہمیں سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہندو دھرم کے بارے میں ان کے نظریات ہیں۔ جن سے ان کی ذہنی کشادگی، وسعتِ قلب اور انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب اِتّباع سنّت میں بہت زیادہ کٹّر تھے وہاں ہمیں اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ وہ مُشرکانِ ہند کے دین کو کُفّارِ عرب کی طرح بے اصل نہیں سمجھتے تھے۔ چودھویں خط میں کسی مرید کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ نوعِ انسانی کی پیدائش کے آغاز میں رحمتِ الٰہی نے دنیا اور عاقبت کی اصلاح کے لئے برہما نامی ایک فرشتے کے ہاتھ ایک کتاب بھیجی تھی۔ مرزا صاحب اس کتاب یعنی چاروں ویدوں کی پوری تفصیل بیان کر کے لکھتے ہیں کہ ان ویدوں کو ماننے والے تمام فرقے خداوند تعالیٰ کی توحید پر متفق ہیں اور دنیا کو حادث و مخلوق جانتے ہیں۔ دنیا کے فنا ہونے، حشرِ جسمانی اور جزائے اعمالِ نیک و بد پر یقین رکھتے ہیں۔ اور جہاں تک ان لوگوں کی بت پرستی کا تعلق ہے یہ لوگ بعض فرشتے جو اللہ کے حکم سے اس عالم کون و مکان پر تصرّف رکھتے ہیں یا بعض کاملوں کی روحیں جن کا جسموں سے ترکِ تعلق کے بعد بھی اس کائنات پر تصرف باقی ہے یا بعض ایسے زندہ لوگ جو ان لوگوں کے خیال میں حضرتِ خضر کی طرح زندہ جاوید ہیں ان کے بت بنا کر اُن

کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اس توجہ کے سبب سے کچھ مدت کے بعد صاحب صورت سے ربط پیدا کر لیتے ہیں۔ مرزا صاحب کے خیال سے ہندوؤں کا یہ عمل صوفیوں کے ذکرِ رابطہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان صوفی اپنے پیر کا بت نہیں تراشتے۔ کفّارِ عرب کی بت پرستی بالکل مختلف چیز ہے۔ کیونکہ اہلِ عرب بتوں کو اپنی ذات سے مؤثر اور متصرف جانتے تھے۔ ان تمام شواہد و دلائل کی روشنی میں مرزا صاحب یہ یقین رکھتے تھے کہ ہندو دھرم خدا کا بھیجا ہوا ہے جو ظہورِ اسلام کے بعد منسوخ ہو گیا۔ اور رام چندر کرشن جی وغیرہ کی عزت اور ان کا احترام کرنا چاہئیے کیونکہ ممکن ہے یہ خدا کے بھیجے ہوئے ولی یا پیغمبر ہوں۔ اسی خط میں مرزا صاحب کی یہ راست فکری اور ذہنی کشادگی محض خیال اور فکر تک محدود نہیں تھی۔ عملی زندگی میں بھی ہندوؤں کے ساتھ ان کا ہمدردانہ اور پر خلوص رشتہ تھا۔ ان کے شاگردوں میں کئی لوگ ہندو تھے۔ جن میں بساون لعل بیدار اور کشن چند مجروح کے نام قابل ذکر ہیں۔ مقاماتِ مظہری اور معمولات مظہریہ میں بہت سے ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن سے مرزا صاحب کے توکل کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے محمد شاہ بادشاہ، وزیروں اور امیروں کی دولت کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ بلکہ ان لوگوں نے جب مرزا صاحب کی خدمت میں دولت کی پیش کش کی تو مرزا صاحب نے کمال استغنا کے ساتھ انھیں ٹھکرا دیا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ جس مکان میں مرزا صاحب کی شہادت ہوئی وہ کیول رام نامی ایک بنیے نے ان کے لئے بنایا تھا[1]۔ ظاہر ہے کہ قبولیت کا یہ شرف صرف دلی تعلق

---

[1] دریائے لطافت صفحہ ۳۹۱۔

کی وجہ سے بخشا گیا ہوگا۔ مرزا صاحب نے اپنے خطوط میں اکثر لوگوں کی سفارشیں کی ہیں۔ بلکہ ایک خط میں کسی امیر سے اپنے ہمشیرزادوں کی سفارش کی ہے۔ مگر اس خط میں ان کا لہجہ اور الفاظ اتنے مؤثر نہیں جتنے کہ اس خط میں ہیں جو انھوں نے برج لال نامی ایک نوجوان کی سفارش میں صرف کئے ہیں۔ برج لال کی بہت زیادہ تعریف و توصیف کے بعد مرزا صاحب لکھتے ہیں :-

"تم کو معلوم ہے کہ ہم نے اس اہتمام سے تم سے کسی کا ذکر نہیں کیا اور ہم کو مبالغہ کی عادت نہیں ہے۔"

(بنام محمد قاسم)

ان خطوط ہی سے ہمیں مرزا صاحب کے تصورِ اخلاق کا بھی علم ہوتا ہے۔ انھوں نے اکثر خطوں میں اپنے مریدوں کو نصیحتیں کی ہیں جو بظاہر ان کی اپنی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ ایک خط میں مرزا صاحب لکھتے ہیں :-

"اپنی بد خلقی سے پیروں کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی تمہارے طریقہ کی طرف آئے تو اس سے خدمت لینے کے بجائے خود اس کی خدمت کرو۔ ہاں اگر وہ محبت کے غلبہ سے خود تمہاری خدمت کرے تو دوسری بات ہے۔"

(بنام شاہ محمد سالم)

آخری عمر میں مرزا صاحب نے قیمتی لباس پہننا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جب محمد قاسم نے انھیں قیمتی کپڑے کے دو تھان بھیجے اور منت وسماجت کی کہ وہ اس کا لباس پہنیں تو مرزا صاحب انکار نہ کرسکے۔ اس مرید کو لکھتے ہیں :-

"اب فقیر کم قیمت کا لباس استعمال کرتا ہے۔ چونکہ تم نے بہت سماجت کی ہے اس لئے تمہاری خاطر سے پہنوں گا۔ ورنہ عدم قبول کی صورت میں تمہیں تکلیف ہو گی۔"

ایک اور خط میں مرزا صاحب صاحبزادہ مرید حسین کو لکھتے ہیں:۔

"فقیر نے خواب میں معلوم کیا ہے کہ تمہاری والدہ باطن میں تم سے ناخوش ہیں۔ والدہ کی ناراضگی آخرت اور دنیا دونوں میں نقصان کا باعث ہے۔"

ایک خط میں ایک خاتون مرید کو لکھتے ہیں:۔

اگر بزرگوں کے ساتھ ادب اور چھوٹوں کے ساتھ پیار اور شفقت سے زندگی گزارو تو کوئی تم سے برائی نہیں کرے گا۔ شوہر کی خدمت اور اطاعت کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ غصّہ و غضب کو پی جانا چاہیے۔

مکتوب (بہتّرواں خط)

مرزا صاحب کی بیوی کو سودا ہو گیا تھا۔ لیکن انھیں طلاق دینا یا ان سے کنارہ کشی کرنا ان کے مسلک اور آئین کے خلاف تھا۔ اگرچہ یہ خاتون زندگی بھر دردِ سر بنی رہیں۔ لیکن مرزا صاحب کی جبین پر کبھی شکن نہ آئی۔ ہمیشہ ان کی خاطر داری اور دیکھ بھال میں کوشاں رہے۔ ایک دفعہ وہ پانی پت گئیں اور غالباً قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے یہاں قیام کیا۔ مرزا صاحب نے ایک خط میں قاضی ثناء اللہ کو لکھا:۔

"تمہیں چاہیے کہ جب وہ (مرزا صاحب کی بیوی) پہنچیں تو انکی دل جوئی اور خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اور وعظ و نصیحت

میں ان پر سختی نہ کرنا۔ اور بہت دلجوئی کرنا۔ اگر فقیر کو پیٹھ پیچھے
برا کہیں تو ہرگز مقابلہ نہ کرنا اور ہرگز ان سے بددل نہ ہونا کیونکہ
ہماری تمہاری خیریت اسی میں ہے۔"

مرزا صاحب اتنے وسیع القلب اور انسان دوست تھے کہ کبھی کسی انسان کا دل دکھانا اور اسے معمولی سی تکلیف بھی پہنچانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ حد تو یہ تھی کہ اگر کسی انسان کا زُہد اور تقویٰ کسی دوسرے آدمی کی تکلیف کا باعث ہو تو وہ ایسے زہد سے دامن بچانا پسند کرتے تھے۔ قاضی ثناء اللہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میرے بھائی! عجیب بات ہے۔ پانی پت کا ہر شخص تمہاری شکایتوں سے بھرا ہوا آتا ہے۔ معلوم نہیں تم کیا کرتے ہو۔ اگر تمہاری سچائی یا دیانت لوگوں کی تکلیف کا سبب ہے تو ایسی راستی سے باز آؤ۔"

وہ کسی سے ناراض بھی نہیں ہوتے تھے اور اگر کسی وجہ سے تھوڑی بہت رنجش ہو گئی تو معمولی معذرت سے دل صاف کر لیا کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"فقیر تمہارے اندازِ تحریر سے ناراض تھا، چونکہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لئے میں نے خود کو زبردستی باز رکھا۔ اور تمہارے حق میں دعائے خیر کی تاکہ خاطر جمع ہو۔ اب جو تم نے معذرت کی ہے دل صاف تر ہو گیا۔ ہم نے معاف کر دیا خاطر جمع رکھو۔"

(ستائیسواں خط)

ایک اور خط میں اپنی ناراضگی بڑی خوبصورت تشبیہ کے ساتھ بیان

کرتے ہیں:۔

"فقیروں کی ناراضگی تو ایک مٹھی خاک کی طرح ہوتی ہے جو دریا میں ڈال دی جائے ۔ اب مجھ پر کوئی اثر نہیں ۔ تم نے اس خط میں حد سے زیادہ معذرت کی ہے ۔ اس نے میرے دل کا غبار دھو دیا ہے ۔ بے فکر رہو۔

(چونتیسواں خط)

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں مرزا صاحب کے بارے میں لکھا ہے:۔

"مرزا صاحب کی تحصیل عالمانہ نہ تھی ۔ مگر علمِ حدیث با اصول پڑھا تھا۔"[۱]

یہ بات صرف وہ شخص کہہ سکتا ہے جسے مرزا صاحب سے ذاتی رنجش ہو یا پھر اس نے ان کے رقعات کا مطالعہ ہی نہ کیا ہو۔ مرزا صاحب نے جس انداز سے تصوف کے اہم ترین مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور انھیں سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ان کی قابلیت اور علمیت کی دلیل ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ شواہد موجود ہیں جن سے ان کے علم و فضل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اور وہ ہیں ان کتابوں کے نام جو مرزا صاحب کے زیرِ مطالعہ ہیں ۔ اور جن کا ذکر خطوط میں کیا گیا ہے ۔ اگر ان کتابوں کی فہرست بنائی جائے تو یہ فہرست مختصر ضرور ہوگی ۔ لیکن اس بات کا ثبوت بھی ہوگی کہ یہ ایک معمولی پڑھے لکھے کے زیرِ مطالعہ نہیں رہ سکتیں ۔ دوسرے یہ کہ مرزا صاحب نے صرف ان کتابوں

۱؎ آبِ حیات صفحہ ۱۴۰۔

ہی کا مطالعہ نہ کیا ہوگا۔

ان رقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب کے مریدوں میں سب سے زیادہ تعداد روہیلوں کی تھی۔ روہیلوں کو ان سے کتنی عقیدت تھی اور کتنے روہیلے ان کے مرید تھے۔ اس کا اندازہ ان کے ایک خط سے ہوتا ہے۔ روہیلکھنڈ کے کسی شہر سے محمد احسان احمدی کو لکھتے ہیں:۔

"اخذ طریقہ کے لئے روہیلوں کا اتنا ہجوم ہے کہ تمام دن توجہ دینے سے فرصت نہیں ملتی۔ فقیر کے پہنچنے کی خبر سن کر یہ لوگ دور دراز علاقوں سے احرام بستہ آتے ہیں۔ سنبھل، امروہہ سے لے کر شاہجہاں پور تک تمام منزلوں میں ٹولی ٹولی بنا کر ایک ایک گروہ، قوم روہیلہ میں سے اکثر اور ہندوستانی لوگوں میں سے کمتر نے اخذِ طریقہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک جماعت ساتھ آئی ہے اور میرے ہمراہ دہلی جانے کا ارادہ رکھتی ہے"۔

مرزا صاحب نے اکثر خطوط میں ان روہیلوں کا ذکر کیا ہے۔ یہی روہیلے مغل حکومت کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ نجف خاں جب برسر اقتدار آیا تو اس نے ان سے نجات پانے کی کوشش کی۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان روہیلوں کی اچھی خاصی تعداد دہلی میں آباد ہو گئی تھی۔ جن میں اکثر آستانۂ مظہر سے وابستہ تھے اور مرزا صاحب ہی کی وجہ سے دہلی میں روہیلوں کی آمد و رفت برابر جاری تھی۔ اس لئے نجف خاں کو مرزا صاحب کے قتل کی سازش میں حصّہ لینا پڑا جس کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جاگیرداری دور میں خانقاہ کا ایک

اہم رول رہا ہے۔ چونکہ عوام اور خود امرا، ورؤسار کے دل و دماغ پر اہلِ خانقاہ کا قبضہ ہوتا تھا اس لئے بادشاہوں کو ہمیشہ یہ خوف رہتا تھا کہ ان برگزیدہ ہستیوں کے ابرو کے ایک اشارے سے ان کی حکومت کا تختہ پلٹا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ ہمیشہ اہل خانقاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستان کی عام زندگی میں جو زوال آیا اس کے اثر سے معدودے چند کو چھوڑ کر باقی خانقاہیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں اور یہ بھی دنیاوی عیش وعشرت، شعر و شراب، رقص و سرود اور غیر اخلاقی اور غیر فطری حرکتوں کی آماجگاہ بن گئیں۔ مرزا صاحب کی خانقاہ کا شمار ان معدودے چند خانقاہوں میں ہے جو نہ صرف اس زوال کے اثر سے بچی رہیں بلکہ جنھوں نے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے چراغ روشن کئے اور انسان کی فلاح وبہبود کے لیے ہر ممکن کام کیا۔ اگرچہ انہیں دنیا اور دنیا والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن انسانی فلاح وبہبود کے لیے وہ تمام سیاسی واقعات سے باخبر رہتے تھے۔ انکے خطوط میں اکثر ان واقعات کا ذکر آگیا ہے جو تاریخی نقطہ نظر سے بہت اہم ہیں۔ ان واقعات سے متعلق تفصیل حواشی میں بیان کردی گئی ہے۔ یہاں صرف چند مثالیں پیش کرنا مقصود ہے۔

مرزا صاحب کسی مرید کو لکھتے ہیں :۔

:پچھلے مہینے کفار سکھ تھانیسر کے قلعہ پر قابض ہوگئے۔ اور انھوں نے خوب قتل و غارت کیا۔

(اکنیسواں خط)

نجف خاں جب شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آیا اور اس نے حکومت کے پورے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تو عوام پر ظلم وستم کی انتہا کردی۔ اس

کے بارے میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔

"جس دن سے نجف خاں آیا ہے اس شہر میں فقیر سے لے کر بادشاہ تک ہر شخص کی حالت خراب ہے ۔ ہر خاص و عام کی زبان پر مجد الدولہ کی رہائی کا ذکر ہے ۔"

عماد الملک اور غلام عسکری خاں کے نام مرزا صاحب کے جتنے خطوط ہیں وہ اس امر کے شاہد ہیں کہ مرزا صاحب خود سیاست میں نمایاں حصہ لیتے تھے ۔ اگرچہ ان کا مقصد صرف انسانی ہمدردی ہوتا تھا ۔ غلام عسکری خاں کے نام وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہاں نواب اور جاٹ کی نجیب خاں سے صلح کا شور مچا ہوا ہے. اور دونوں طرف کے معتبر رازداروں سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی مصلحت کی وجہ سے جاٹ راجہ بہادر سنگھ اور دلیر سنگھ کے توسط سے روہیلوں سے دوستی کرتا ہے ۔"

احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ہندوستان کے تمام افراد کو پریشان کر رکھا تھا ۔ مرزا صاحب غلام عسکری خاں کو اس کی آمد کی اطلاع ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

"شاہ ابدالی نے پشاور میں قیام کیا ہے اور اپنے بڑے لڑکے تیمور مرزا کو بہت بڑی فوج کے ساتھ ممالک خراسان کے بندوبست کو رخصت کیا ہے ۔ اگر اس کی ضرورت پڑی کہ وہ (احمد شاہ ابدالی) خود سفر کرے تو وہ لاہور اور ملتان تک پہنچ جائے گا ۔"

یہ بھی مرزا صاحب کے خطوط ہی سے پتہ چلتا ہے کہ روز روز کے ہنگاموں سے تنگ آکر انھوں نے دہلی چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا تھا اور اس ارادہ کو عملی

شکل دینے کے لئے وہ روہیلکھنڈ چلے گئے تھے تاکہ جائے سکونت کا انتخاب کرسکیں۔ مرزا صاحب نواب فیض اللہ خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"جذبِ قسمت اور احباب کی کشش کی وجہ سے فقیر سنبھل پہنچا ہے۔ امروہہ اور مرادآباد بھی دیکھا تاکہ مستقل قیام کے لئے جگہ کا انتخاب کیا جائے اور متعلقان کو بلانے کا خیال کیا۔ کیونکہ دہلی میں روز روز کی پریشانیوں سے تنگ آگیا ہوں۔ متعلقان کو بلانے کے لئے آدمی بھیجا۔ انھوں نے معقول عذر لکھ دیے۔ مجبوراً دہلی جانا پڑا۔"

مرزا صاحب کے خطوط واحد ذریعہ ہیں جن سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیاست میں باقاعدہ حصّہ لیتے تھے۔ اگرچہ خود انھیں ہوسِ مال وزر نہ تھی۔ لیکن وہ سب کچھ رضائے خداوندی کے لئے کرتے تھے۔ نواب عماد الملک کے بارے میں مرزا صاحب غلام عسکری خاں کو لکھتے ہیں:۔

"اگر نواب ہمارا سلیقہ چاہتا ہے اور ہماری سلامت عقل پر بھروسہ کرتا ہے اور اچھی بری باتوں میں ہم سے صلاح لیتا ہے تو خلق اللہ کے لئے قوی توجہ اور مفید تدبیر کو ہم کام میں لائیں گے۔"

مرزا صاحب تمام سیاسی واقعات سے باخبر رہتے تھے۔ ایک خط میں غلام عسکری خاں کو لکھتے ہیں:۔

"شہر کے حال سے لے کر محل کی خبروں تک فقیر سے کچھ نہیں چھپا اور جو کچھ حقیقت ہے فقیر تک پہنچ جاتی ہے۔ ہر چند میں نے کئی بار اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نواب جو کچھ کرنا چاہے مجھے بتا دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ورنہ میں ایسی بنیاد رکھتا کہ

لوگ دیکھتے رہ جاتے۔"

ان خطوط سے، ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب کے ہمشیرزادے اور ایک صاحب زادے پیر علی بھی تھے۔ غالباً پیر علی کا دوسرا نام مرزا شاہ علی تھا۔ ان کی دو بیویاں اور تین لڑکے تھے اور انھیں بھی اپنی ماں کی طرح، سودا تھا۔

اس مختصر سے مقدمہ میں صرف بعض اہم واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرزا صاحب کے سوانح اور اس دور کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ خطوط کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔

خطوط

(۱)

برخوردار تم نے دوبارہ التماس کیا ہے کہ فقیر اپنا حسب و نسب لکھے۔ چونکہ اس میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا اس لئے میں نے تغافل کیا۔ اب جب کہ (تمہاری) منت و سماجت حد سے بڑھ گئی ہے (تو) مختصر طور پر تحریر کیا جاتا ہے۔ معلوم ہونا چاہئیے حقیقت میں اس فقیر کا سرمایۂ وجود کا آغاز ایک قطرۂ آب اور انجام ایک مُشتِ خاک ہے۔ اور اِس عالم اعتبار میں خاکسار کی نسبت کا سلسلہ چھبیس ۲۶ واسطوں سے حضرت محمد بن حنفیہ کے توسط سے شیر بیشۂ کبریا علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ و الثناء تک پہنچتا ہے۔ فقیر کے اجداد میں سے ایک بزرگ آٹھویں صدی ہجری میں کسی تقریب سے (ترک وطن کر کے) طائف سے ترکستان آئے تھے۔ انھوں نے اس علاقے کے ایک حاکم کی لڑکی سے جو قبیلہ الوس قاقشالان کا سردار تھا شادی کر لی۔ چونکہ اس کا (حاکم کا) کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لئے اس علاقے کی حکومت کا تعلق ان کی (امیر کمال الدین) اولاد سے ہو گیا۔ جب ہمایوں بادشاہ نے مملکت ہندوستان کو سرکش پٹھانوں سے نجات دلائی تو اس خاندان کے دو بھائی محبوب خاں[1] اور بابا خان[2] کو ساتھ لایا۔ جن کا سلسلہ تین پشت پر امیر کمال الدین سے ملتا تھا۔ ان دونوں کا حال عہدِ اکبری کی تاریخوں میں لکھا ہوا ہے۔ ان بزرگوں کا نسب مادری امیر صاحب قرآن کے خاندان تک پہنچتا ہے اور فقیر کا سلسلہ چار واسطوں سے بابا خان پر منتہی ہوتا ہے۔ خان مذکور بابا خان نے عہدِ اکبری میں بغاوت کی تھی (۳) اس جرم کی پاداش میں

میرے والد بھی کم منصبی کی سزا میں گرفتار تھے (۴) انھوں نے عمر کا بڑا حصہ اورنگ زیب کی خدمت میں گزارا۔ آخر ترک دنیا کی دولت سے مفتخر اور ممتاز ہوئے۔ اور قادریہ سلسلے کے ایک بزرگ کی خدمت سے استفادہ کیا۔ انھوں نے ۱۱۳۰ھ میں اس دنیا سے رحلت کی۔ فقیر کی ولادت ۱۱۱۳ھ (۵) میں ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ بیس سال کی عمر میں کمر ہمت باندھ کر دنیا سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور فقر کی راہ میں ریاضت شروع کی۔ علوم متعارفہ والد کے زمانہ میں پڑھے اور کتب حدیث حاجی محمد افضل سیالکوٹی (۶) کی خدمت میں پڑھیں۔ جو شیخ المحدثین شیخ عبد اللہ بن سالم مکی کے شاگرد تھے۔ اور قرآن مجید شیخ القراء شیخ عبد الخالق شوقی کے شاگرد حافظ عبد الرسول دہلوی سے سند کیا۔ طریقۂ نقشبندیہ کا خرقہ اور اجازت مطلقہ جناب سید السادات نور محمد (۷) بدایونی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حاصل کیے جن کا سلسلہ دو واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ ایک عمر اُن کی خدمت میں گزاری ان کی وفات کے بعد اس طریقہ کے متعدد مشائخ سے استفادہ کیا۔ اور آخر کار مدت تک فیض آشیانہ حضرت شیخ الشیوخ محمد عابد (۸) سنامی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آستانے پر جبہ سائی کی۔ ان کا سلسلہ بھی دو واسطوں سے حضرت مجددؒ سے ملتا ہے۔ ایک مدت تک ان کی خدمت کر کے قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ طریقوں کا خرقہ اور اجازت ان سے حاصل کی۔ آج تک کہ ۱۱۸۵ھ ہیں ان بزرگوں کے حکم کے مطابق تیس سال سے طالبان خدا کی تربیت کر رہا ہوں خدا اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے خاتمہ بالخیر کرے

۱۱۸۵ھ

(۲)

مخدوما! اس بار تم نے دو شبہات لکھے ہیں: ایک یہ کہ حضرت سرہند (مجدّد الف ثانی) کے خلفا بلند کمالات اور مقامات کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کے آثار اولیائے متقدمین کی طرح ان میں ظاہر نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے مریدوں کو بڑی بڑی بشارتیں دیتے ہیں لیکن انکے حالات ان بشارتوں کے مطابق نہیں ہوتے۔ نیز یہ کہ اس سے ان درویشوں کا اکابرِ سابقین کے برابر ہونا بلکہ ان پر فضیلت لازم آتی ہے اور یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے پہلے شبہ کا جواب تو یہ ہے کہ اگلے بزرگوں نے بھی (مراتبِ فنا) کے تحقق کے باوجود کمالاتِ عُلیا کا دعویٰ کیا ہے۔ اس فرقہ کی کتابیں ان مطالب سے بھری ہوئی ہیں مختصر یہ کہ اس فرقہ کی ایک جماعت تو ان امور کے اظہار پر مامور ہے۔ اور ایک فرقہ کو غلبۂ سکر کی وجہ سے معذور کیا گیا ہے۔ لہذا ان لوگوں کے معاملے میں بھی ان دونوں احتمالات میں سے کوئی ایک سمجھ لینا چاہیے۔ سوائے نبوت کے کوئی کمال بنیادی طور پر ختم نہیں ہوا ہے۔ مبدأ فیاض سے بخل اور دریغ تو ممکن نہیں پھر ان بزرگوں کے حق میں حسنِ ظن سے کیا چیز مانع ہے۔؟ آخر یہ صلحائے مسلمین میں ہیں۔ اور اگر آثارِ کمال کے ظہور سے استقامت مراد ہے جسے فوقِ کرامت کہا گیا ہے تو اس سلسلے کے قوی لوگوں سے یہ (استقامت) خود پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ اور ضعف خارج از اعتبار ہے، اور اگر آثار (کمال) سے مراد خرقِ عادات اور مکاشفات کا ظہور ہے جسے عوام پسند کرتے ہیں تو یہ باتیں صوفیا کے نزدیک نہ تو ولایت کے لئے شرط ہیں اور نہ لازم۔ یہ بات مخفی نہیں

کہ صحابۂ کرامؓ سے بھی جو اُمّتِ مرحومہ کے تمام افراد سے افضل ہیں ایسی باتیں کم ظاہر ہوئی ہیں۔ چونکہ اس طریقہ کی ریاضتیں اور مجاہدے صحابۂ کرام اور ان کے تابعین کے مطابق اور کتاب وسنت کے اتباع میں ہیں اس لئے اس طریقہ کے لوگوں کا ذوق اور وجدان بھی اسی جماعت (صحابہ) کے مطابق واقع ہوا ہے۔ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ (پس تم شک کرنے والوں میں نہ ہو) شبہ دوم کا جواب یہ ہے کہ اہلِ کمال کے آثارِ باطنی کا معلوم کرنا آسان کام نہیں ہے خاص طور پر اس طریقہ کی نسبتِ بے کیف کو سمجھنا ہر عمرو زید کی بس کی بات نہیں۔ لیکن جو لوگ صحیح فراست رکھتے ہیں ان سے یہ بات مخفی نہیں ہے اور نہ رہتی ہے۔ آثارِ ظاہری میں جس میں کثرتِ طاعت وریاضت اور افراطِ ذوق وشوق، تجرد اور انقطاع از دنیا دونوں شامل ہیں اہلِ اخلاص وریا اور اربابِ حق وباطل سب شریک ہیں۔ احیاناً گناہوں کے سرزد ہو جانے سے معصومین کے سوا کوئی محفوظ نہیں ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ نبوّت کا زمانہ دور ہونے اور قیامت قریب آنے کی وجہ سے تمام امورِ ظاہری وباطنی میں مکمل ضعف آگیا ہے۔ لیکن یہ بشارتیں بے حقیقت نہیں ہیں۔ ایسی بشارتوں سے شیخ کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ مرید نے اس مقام سے (جس کی شیخ بشارت دے رہا ہے) کچھ بہرہ حاصل کر لیا ہے نہ یہ کہ مشہور اولیاء کی طرح اس مقام (سلوک) میں قوت اور رفعت پیدا کر لی ہے جس سے مساوات لازم آئے۔ اگر خوش استعداد آدمی ایک عمر تک اس کام میں جدوجہد کرے اور ان بزرگوں کی دولت میں شریک بن جائے تو یہ بات محالات میں سے نہیں ہے۔

فیض روح القدس از باز مدد فرماید دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

جاننا چاہیئے کہ ان حضرات کی نسبت انعکاسی ہے جیسے آئینہ میں سورج کی روشنی

اس کے لئے خاصا وقت چاہیے کہ باطن کے انوار بھی آئینہ میں اپنا انوار دینے کے قابل بن سکیں ۔ یہ انعکاس یقین میں بدل جائے اور مرید کمال و تکمیل کے مرتبہ کو پہنچ جائے۔ بعض اوقات مقام کا عکس مرید کے آئینۂ باطن میں پڑنے لگتا ہے مگر وہ مقام مرتبۂ تحقق تک پہنچا نہیں ہوتا ۔ اور پیر کشفِ دقیق یا نظرِ تحقیق کو کام میں لائے بغیر مرید کو اس مقام کی بشارت بھی دے دیتا ہے لیکن پیر سے مفارقت کے بعد وہ نسبت جو بشرط محاذات ظاہر ہوئی تھی چھپ جاتی ہے ۔ ایسی صورت میں اگر آثار ظاہر نہ ہو پائیں تو ٹھیک ہے ۔ یہ غلطیاں خصوصاً اس زمانے میں بہت رواج پا گئی ہیں کہ پیروں میں نسبتِ کشفی کمیاب ہے اور مرید ضعفِ ہمت کے باعث اجازتِ ارشاد اور بشارتِ مقام کے لئے مضطرب رہتے ہیں ۔

وَالسَّلَام

تم نے پوچھا تھا کہ صوفیوں کی اصطلاح میں نسبت کے کیا معنی ہیں۔ جاننا چاہیے کہ عربی لغت میں نسبت کا مطلب طرفین کا تعلق ہے اور اِس قوم (صوفیہ) کی اصطلاح میں وہ تعلق مراد ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان ہوتا ہے اور جیسے متکلمین صانع اور مصنوع کے رشتے سے تعبیر کرتے ہیں جیسے کوزے کو کمہار سے رشتہ ہوتا ہے۔ اور بہ ظاہر کتاب و سنت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ صوفیہ، اگر وہ وحدت الوجود کے ماننے والے ہیں تو اس نسبت کی تعبیر کثرت میں وحدت کے ظہور سے کرتے ہیں۔ جیسے موج وحباب کی صورتوں میں پانی کا ظہور۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کثرت ہماری حقیقی وحدت میں کبھی مزاحم نہیں ہوتی۔ اس تعبیر کا حاصل عینیت حق سے تعلق کا اثبات ہے۔ اور اس مطلب کو تاویلوں اور تمثیلوں کے ساتھ شرعی اور عقلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

اگر وہ (صوفیہ) وحدت الشہود کے ماننے والے ہیں تو اس نسبت کو اصل اور ظل کے تعلق سے ثابت کرتے ہیں۔ جیسے سورج سے نکلنے والی روشنی کو سورج سے نسبت ہے۔ یہاں "ظل" سے تجلّی مراد ہے۔ یعنی مرتبۂ ثانیہ میں کسی چیز کا ظاہر ہونا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کثرت وجوداتِ ظلی وحدتِ وجودِ حقیقی میں مخل نہیں ہو سکتی۔ پہلی اور دوسری تعبیر میں اتنا ہی فرق ہے۔

کہ ہر چند "ظل" کی کوئی اور حقیقت اپنی اصل سے ہٹ کر نہیں ہے۔ وہی اصل ہے جس نے مرتبۂ ثانی میں ظہور کر کے خود کو ظل کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔ لیکن اس جگہ ایک کو دوسرے سے مشابہ خیال کرنا ٹھیک نہیں۔ مگر یہ تشابہ موج و دریا [کی تشبیہ] میں ٹھیک ہے۔ اس لئے شہودیہ اس تعبیر کے مطابق اثبات غیریت کرتے ہیں۔ اور اس طرح کرتے ہیں کہ [اس تعبیر اثبات غیرت سے] توحید وجود حقیقی میں خلل واقع نہ ہو اور کتاب وسنّت سے یہ بات بہ آسانی مستنبط کی جا سکے۔ اور پہلی تعریف کے مطابق نسبت کے معنی کی تفسیر صوفیہ وجودیہ کی کتابوں سے معلوم کرنا چاہیے۔ اور شہودی صوفیہ کے نزدیک اس کی تفصیل یوں ہے کہ حقائقِ ممکنات علم الٰہی کے مرتبے میں عدم اور وجود سے مرکب ہیں اس طرح کہ اعدامِ اضافیہ یعنی عدم العلم جو جہل سے عبارت ہے اور عدم القدرت جسے عجز کہا جائے گا وغیرہ جو الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں اور ان سے مرتبۂ الٰہی کا ثبوت پیدا ہوتا ہے اور صفاتِ حقیقیہ کے آئینے جو ان عدمات کے مقابل ہیں اور ان صفات کے عکس ان آئینوں میں منعکس ہوتے ہیں اور یہ مخلوط تعینات عالم کے مبادی ہیں۔ پس ان کے نزدیک "اعیانِ ثابتہ فی العلم" اعدام اضافیہ اور صفاتِ حقیقیہ کے پرتو سے مرکب ہیں۔ اور خارج ظلی کے آئینوں میں جو خارج حقیقی کا ظل ہے، آثارِ خارجیہ کے مصدر بن گئے ہیں۔ پس ان کے نزدیک اعیانِ خارجیہ وجودِ ظلی میں موجود ہیں، نہ کہ وجودِ حقیقی میں اور خارجِ ظلی میں متحقق ہیں جو وجودِ حقیقی کے تحقق کی منزل ہے۔ اور دنیا میں جو کچھ موجود ہے اور اس کے توابع سب ظلاً یا انعکاساً خدا کی ذات سے مستفاد ہیں۔ کیونکہ وجودِ حقیقی کے ساتھ خارجِ حقیقی میں سوائے خدا کے کوئی شئے موجود نہیں فھذا ھو التوحید (بس یہی توحید ہے)۔ اور چونکہ عدم مقام ہے شر اور نقص کے پیدا ہونے کا اور وجود

مبداء خیر و کمال ہے اور دنیا عدم و وجود دونوں سے مرکب ہے بلکہ عدم اس کا ذاتی ہے اور وجود عارضی۔ اور وجود حق بسیط ہے اور خیر محض اور حسن محض ہے، وہ عین عالم نہیں ہو سکتا۔ ناچار دنیا حسن و قبح کا مجموعہ ہوگی لیکن تمام وجوہِ حسن خدا کی ذات سے مستفاد ہیں۔ اور برائی کے عدم کی پہلو طرف سے آئے ہیں۔ پس جب سالک اپنی استعداد کی قوت سے اور جذبِ مشائخ سے جو جذبۂ الٰہی کا کا پرتو ہے پہلوِ عدم کی ہیر علمی کے ذریعہ امکان کی پستی سے وجوب کی بلندی کی طرف سفر کرتا ہے جو عبارت ہے ان ظلمانی اور نورانی حجابوں کے دور ہو جانے سے جو حدیث کے مطابق خدا اور خلق کے درمیان حائل ہیں تو اس نسبت محاذات کے فیوض و برکات جو ظاہر اور مظہر کے درمیان متحقق تھے وہ ان پردوں کے ہٹ جانے سے جو سالک کے آئینۂ وجود میں انوار شمس حقیقی کے منعکس ہونے میں مانع تھے دور ہو جاتے ہیں اور ان انوار کا غلبہ آئینہ کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اس حالت کو "نسبتِ فنا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور فنا کے بعد یہ لازم ہے کہ خدا کی طرف سے ہر مقام کے مطابق وجود وہبی عطا ہو۔ جس سے سالک بشریت کے کارخانے (کارِ استحکام) اور شریعت کے احکام کا قیام کر سکے۔ اسی کو نسبتِ بقائی کہتے ہیں۔ پس اگر سالک تمام ظلمانی اور نورانی حجابات دور کر کے صفات اور شیونات کی تجلیات سے گزر کر تجلّی ذاتِ بحت سے مشرف ہو جائے اور زمانۂ نبوت باقی ہو تو نبی ہو جاتا ہے اور عصمت کے درجہ میں پہنچ جاتا ہے جہاں صدورِ شر کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔ ورنہ امکان سے وجوب کی طرف جتنی مسافت طے کی ہے اس کے مطابق عدم سے جو "شرِ محض" ہے دور ہو جاتا ہے اور چونکہ ظلماتِ عدم انوار کے غلبہ سے مضمحل ہو جاتی ہیں اس لئے (سالک) مصدرِ خیر بن جاتا ہے۔ لیکن چونکہ احیاناً وقوعِ شر کا احتمال باقی ہے، ولی یا نائب

نبی ہو جاتا ہے۔ اور بنی نوع انسان کی تربیت اور اصلاح کرتا ہے۔ یہی بات ہے جسے یوں کہا گیا ہے کہ انبیاء معصوم اور اولیاء محفوظ ہیں اور یہی ظہور نسبت کے معنی ہیں۔ جو اس قوم (صوفیہ) کی اصطلاح ہے اور مختصراً صوفیہ نقشبندیہ مجددیہ کا مشرب ہے۔ رحمہم اللہ (اللہ ان پر رحم کرے) والسلام۔

(۴)

مخدوما! آپ کا سوال ہے کہ حصول فنا کے بعد حضوری دائم لازم ہے (پھر اگر سالک کو) جنابِ حق تعالیٰ کی طرف سے کبھی کبھی غفلت ہوتی ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ جاننا چاہیے کہ اس شبہہ کی بنیاد ایک اشتباہ پر ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ علم دو طرح کے ہیں: حضوری اور حصولی۔ حضوری تو نفس عالم کو لازم ہے یا اس کا عین ہے۔ جیسے نفس کا علم اپنے بارے میں اور اپنے غور و خوض کے بارے میں اور حصولی، عقل اور حواس کے توسط سے ذہن کے آئینے میں معلومات کی صورتوں کا حاصل ہونا ہے اور سالک جو سیر علمی کے ذریعہ امکان کی پستی سے وجوب کی بلندی تک پہنچتا ہے تو اس کے لئے یہ علم حضوری بن جاتا ہے، حصولی نہیں رہتا۔ اور جناب باری سے عارف کے علم حضوری کے تعلق کی کیفیت یہ ہے کہ صوفیوں کے نزدیک اشیاء کا وجود ظلی ہے حقیقی نہیں۔ یعنی یہ کثرت جو دکھائی دیتی ہے، تعدد شیونات کے اختلاف کی وجہ سے ہے اور ظل جب تک اپنی اصل سے غافل ہے اور اپنی ظلیت سے آگاہ نہیں وہ اپنے پندار میں اپنا مستقل وجود سمجھتا ہے اور گفتگو کے دوران میں لفظ "میں" سے اسی وجود وہمی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور جب اس قوم کی اصطلاحی مسافت (سلوک) طے کر لیتا ہے جو خدا اور مخلوق کے درمیان سے ظلمانی اور نورانی حجاب دور ہونے سے عبارت ہے اور حدیث سے ثابت ہے تو اپنی اصل سے واصل ہو جاتا ہے۔

اور خود کو اصل کے پرتو سے زیادہ نہیں پاتا اور اپنے وجود اور اس کے توابع کو اصل سے مستعار سمجھتا ہے اور یہ راز جان لیتا ہے کہ ظل کی حقیقت علیحدہ کچھ نہیں ہے بلکہ وہی اصل ہے جس نے دوسرے مرتبۂ ثانی میں تعین ظلی کے ساتھ ظہور کیا ہے ۔ اس پر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ "میں" کا مرجع اور مشارٌ الیہ وہی اصل ہے نہ کہ پرتو اور اس وقت اس کا علم حضوری جو اس تعینِ ظلی کو لازم تھا اصل سے متعلق ہو جاتا ہے ۔ اولاً لفظ "انا" کا اشارہ راجع ہوتا ہے اصل کی طرف اور چونکہ یہ اصل کے اعتباروں میں سے ایک اعتبار ہے اس لئے مرتبۂ ثانی میں "انا" ظل کی طرف راجع ہوتا ہے ۔ اور جب یہ حالت مستقل جاری ہو جائے تو اسے دائمی حضوری کہتے ہیں اور تحقق فنا کے بعد اس حضوری کو زوال نہیں ہے اور کبھی اس حالت میں فتور واقع ہو جائے تو علم العلم میں ہوتا ہے نہ کہ عین علم حضوری میں ۔ اور جب تک عارف کے حواس باقی ہیں علم حصولی عوام النّاس کی طرح باقی رہتا ہے ۔ کیونکہ بشری امور کا ظہور اس پر موقوف ہے ۔ اس علم کو خدا کی جناب میں ہرگز دخل نہیں ہے ۔ کیونکہ حواس کا اس بارگاہ میں کوئی گزر نہیں ۔ اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ علم العلم کے مغالطہ کو علم حضوری کا فتور سمجھ کر دوامِ حضور سے منکر ہو جاتا ہے ۔ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے اصلّی واجھّز الجیش ، (میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور لشکر کی تیاری بھی کرتا ہوں) اس سے دونوں علموں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ لشکر کی تیاری کا تعلق علم حصولی سے ہے اور نماز میں حضوری کا ہونا علم حضوری سے متعلق ہے ۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آنجناب کی نماز بے حضور نہیں ہو سکتی اور جہاد کی تدبیر تصوّر اسباب کے بغیر نہیں ہو سکتی ۔ پس جب تک دونوں طرح کے علم ایک ساتھ نہ ہوں جو دو عبادتوں کا تداخل ہے یہ دونوں

کام ایک ہی وقت میں ایک ہی شخص سے ظاہر نہیں ہو سکتے۔ ایسی صورت میں خلیفۂ ثانی کے قول کے معنی بھی صحیح نہیں رہتے۔ فافہم (پس اس پر غور کرو)

والسّلام

برخوردار! اُن شبہات کے متعلق جو بے وقوفوں کے نزدیک حضرت مجددِ الف ثانیؒ کے مقامات پر وارد ہوتے ہیں۔ تمہارے سوالات نظر سے گزرے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ان اعتراضات کی بنیاد جہالت پر ہے یا حسد پر۔ انکار کرنے کی رسم بہت پرانی ہے۔ اہلِ تعصب نے شیخ اکبر رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرے اکابر کی تکفیر میں بہت سے رسالے لکھے ہیں اور حضرتِ مجدد نے دفعِ دخل کے طور پر اپنے مکاتیب میں ان تمام شبہات کے جواب دیئے ہیں۔ ان کی اولاد امجاد میں حضرت شاہ یحییٰ رحمتہ اللہ علیہ نے اس باب میں ایک مفصل رسالہ لکھا ہے۔ اور حضرت مولوی فرخ شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے بھی "کشف الغطاء عن وجہ الخطاء" کے نام سے ایک مختصر رسالہ لکھا ہے اور انکے ایک مخلص مولانا محمد بیگ ترکی ثم المکی نے بھی ایک رسالہ "عطیۃ الوہاب الفاصل بین الخطاء والصواب" کے نام سے لکھا ہے۔ جو بطورِ سوال و جواب ہے۔ اور محمد برزنجی شاگردِ ابراہیم کردی ثم المدنی کے رسالے کے رد میں لکھا ہے اور عرب کے چاروں مذاہب کے علماء کی مہریں اس پر ثبت کرائی ہیں۔ وہ معارف جو نامانوس تھے جب ظاہر ہوتے ہیں تو حسد کا سبب بنتے ہیں۔ اور مادہ حسد ان معارف غیر متعارف کی بنا پر ہے جو آنجناب (حضرت مجدد) سے قرونِ اولیٰ میں شیوع پذیر

ہوئے ۔ مشہود بالخیر قرون ثلثہ کے بعد پردۂ کمون میں چلا گیا تھا ۔ اور ان کی (حضرتِ مجدد) کی طینت مطہرہ کی خصوصیت سے ظاہر ہوا ۔ کیونکہ یہ آں حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طینت مطہرہ کا بقیہ تھا ۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ پہلے ان مقالات کے فاعل کی طرف نظر کی جائے ، اگر وہ کتاب اور سنت کے تابع ہے اور اس کے اکثر اعمال و اقوال میزان شریعت پر موزوں ہیں تو اس کے کلام کے متشابہات کی تاویل اس کے کلام کے محکمات کے موافق کی جائے یا اسے ڈھکی چھپی باتوں کے جاننے والے یعنی خدا پر چھوڑ دیا جائے اور اسے معذور سمجھا جائے ۔ کیوں کہ اس قوم (صوفیہ) کی بہت سے عذر ہوتے ہیں کبھی ان کی عبادات، حال کے غلبہ ہیں ان کی مرادات کی مساعدت نہیں کرتیں اور کبھی معلومات کشفی میں وہم اور خیال کے مخلوط ہو جانے سے غلطی ہو جاتی ہے ۔ اور اس خطا میں وہ اجتہادی خطا کی طرح معذور ہیں اور کبھی ان کی اصطلاح کی اطلاع بہتر نہیں ہوتی ۔ پس ان امور کے پیش نظر اعتراض ترک کرنا لازم ہے خاص طور پر حضرتِ مجددؒ کے کلام کرامت انتظام پر اعتراض کرنا بالکل فضول ہے ۔ کیونکہ ان کے طریقہ کی بنیاد اتباع سنت پر ہے اور ان کی تصنیفات بھی ایسی ہی نصیحتوں سے بھری ہوئی ہیں ۔ اس فتنہ کے ہیجان کا بڑا سبب توحید وجودی سے منکر ہونا اور توحیدی شہودی کا ماننا ہے ۔ کیونکہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے لے کر آپ کے دور مبارک تک لوگوں کے ذہنوں پر وحدت الوجود کا مسئلہ چھایا ہوا ہے ۔ حضرتِ مجدد کا توحید وجودی سے انکار کرنا علمائے ظاہر کے انکار کی طرح نہیں ہے ۔ بلکہ جس مقام سے وحدت الوجود کے ماننے والے بات کرتے ہیں آپ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اسے تسلیم کرتے ہیں ۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ اصلی مقام کو اس سے زیادہ بلند بتاتے ہیں ۔ اور غیریت کو جو خدا اور مخلوق کے درمیان ہے

اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ وہ وجودِ حقیقی، جو خارج حقیقی میں متحقّق ہے، کی وحدت میں مخل نہ ہو ۔ وحدت الوجود کے ماننے والوں کے برخلاف جو خلق اور خالق کے درمیان عینیت ثابت کرتے ہیں ۔ وحدتِ وجود اور شہود کا مسئلہ اور خطوں میں علیحدہ لکھا گیا ہے ۔

والسّلام ۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد فقیر جانجاناں کی طرف سے مولوی صاحب مہربان سلمہ الرحمٰن مطالعہ فرمائیں کہ آپ کا ایک طویل التفات نامہ ملا۔ جس میں حضرت قیوم ربّانی مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ، کے مقالات، کرامات سمات پر شبہات کئے گئے ہیں۔ مخدوما بہ شبہات اس لئے ہیں کہ حضرتِ مُجَدّد کی اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھا نہیں گیا اگر ممکن ہو تو آنجناب کے مکتوبات کی تینوں جلد وں کا مطالعہ کیجئے۔ خاطر جمع ہو جائے گی۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں (ان شبہات سے متعلق) چند باتیں لکھتا ہوں۔

جاننا چاہیئے کہ صوفیہ لفظ "وجود" کا اطلاق تین معنوں پر کرتے ہیں: ایک وجود بمعنی کون (ہونا) اور حصول (حاصل ہونا) جو کہ ایک امر انتزاعی اور معقول ثانوی ہے۔ دوسرے وجودِ منبسط جو پہلے معنی کے انتزاع کے تغیّر کرنے والا ہے۔ اور صادرِ اول ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جو انتزاع معنی اول کے منشا اور ظاہر وجود کا، دونوں وجود ذاتِ باری تعالیٰ سے متاخر ہیں اور ذات ان دونوں وجود سے مصدرِ آثار نہیں ہو سکتی۔ تیسرا وجود وہ ہے جو اوّل الاوائل اور مبدأ المبادی ہے اور اس قوم کے خیال میں عین ذات ہے اور ذات اس وجود سے مصدرِ آثار ہے۔ حضرتِ قیوم ربانی فرماتے ہیں کہ ذاتِ حق خود اپنے آثار کا مصدر ہے۔

جب وجود اور ذات حقیقت میں ایک ہوں تو آثار کے صادر ہونے کو چاہے وجود سے منسوب کر دو چاہے ذات سے مطلب ایک ہی ہے۔ پس یہ اختلاف و نزاع محض لفظی ہے۔ تسلسل کو یہاں کیا دخل ہے۔ تسلسل تو اس وقت لازم آتا جب وجود تعالیٰ کسی دوسرے موجود سے مستفاد ہوتا اور اس وجود سے مصدر آثار ہوتا اور اس موجود کا بھی ایسا ہی حال ہوتا آپ کا لفظِ وجود کا ذات خداوندی پر اطلاق کرنا اور حمل بالمواطات سے ایک کا دوسرے سے بچنا احتیاط کی وجہ سے ہے کیونکہ شرع میں کہیں یہ اطلاق وارد نہیں ہوا۔ اور خدا کے نام اور صفات توقیفی ہیں اور تمہارے دو شبہ جو حقیقت محمدی اور حقیقت محمدی پر حقیقت کعبہ کی فضیلت کے بارے میں ہیں وہ مکتوبات کی تیسری جلد سے رفع ہو جائیں گے۔ ان شبہات کا جواب تو بہت طویل ہو گا۔ اور جو کچھ آپ نے حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کے قول قدمی علی رقبۃ کل ولی اللہ (میرا پاؤں اللہ کے ہر ولی کی گردن پر ہے) کے بارے میں لکھا ہے۔ اگر معاصرین سے مخصوص کریں تو آنجناب پر کیا نقصان عائد ہوتا ہے۔ اور ادب کی وجہ سے متقدمین کو مستثنیٰ کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ ان میں کچھ آنحضرت کے مشائخ اور اجداد ہیں اس حدیث کی رو سے لا یدری اولہ خیر ام اٰخرہ یہ نہیں معلوم کہ اسکا اول بہتر ہے یا اسکا آخر متاخرین مستثنیٰ ہو جاتے ہیں کیونکہ تقدیم اور تاخیر ایک نسبی امر ہے اور ہر متاخر کا ایک متاخر ہے اس لئے ممکن ہے کہ ان کا متاخر ان سے افضل ہو۔ کمالات نبوت کے علاوہ اور کمال قطعی طور پر ختم نہیں ہوتے۔ میں آپ کے التفات نامہ کے مطابق حق اور باطل میں فرق کرنے پر مامور تھا والمامور معذور اللھم ارنا الحق حقا وارنا الباطل باطلاً (جو شخص کسی کام پر مامور ہوتا

ہے وہ مجبور ہوتا ہے ۔ اے خدا تو ہمیں سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کر دکھا۔) والسّلام۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد فقیر جانجاناں کی طرف سے مطالعہ فرمائیں کہ آپ کا التفات نامہ موصول ہوا۔ جس میں آپ نے پوچھا تھا کہ جناب قیوم ربانی مُجَدّد الف ثانی اور محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں کس کو افضلیت حاصل ہے۔ مخدوما فضیلت دو طرح کی ہے۔ جزوی اور کُلّی۔ ظاہر ہے کہ تمہارا سوال جزوی فضیلت کے متعلق نہیں ہے۔ اور فضلِ کلی قرب الٰہی کی زیادت پر منحصر ہے اور اس کا تعلق باطن سے ہے اور عقل کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن عقل مناقب کی قلت یا کثرت سے مطلب کا سراغ لگاسکتی ہے۔ لیکن افادہ کو قطع نہیں کر سکتی ہے اور نقل عبارت ہے کتاب و سنت اور قرنِ اوّل کے اجماع سے۔ اور یہ بھی بدیہی بات ہے کہ ان دونوں کا وجود کتاب و سنت کے ورود اور اجماع امت کے ورود سے متاخر ہے۔ اور شرع کے یہ تینوں اصول اس بارے میں خاموش ہیں۔ اور کشف میں غلطی کا احتمال ہے اور مخالف پر حجّت نہیں ہے۔ اور مریدوں کے اقوال قابل اعتبار نہیں کیونکہ مریدوں سے اپنے پیروں سے غلو کی حد تک محبت ہوتی ہے۔ اور ایسا صاحبِ کشف بھی نظر نہیں آتا جو ان دونوں حضرات کے کمالات کا احاطہ کرے اور ان میں سے کسی ایک کی فضیلت کلّی کا قطعی فیصلہ کر دے۔

اس لئے سب سے زیادہ سلامتی کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو علم الہٰی کے سپرد کردیا جائے۔ اور ایسی فضول باتوں کی طرف سے خاموشی اختیار کی جائے۔ ان دونوں بزرگوں کے فضائل کا اعتراف کرنا چاہیے اور اس میں زبان کھولنا سوئے ادب ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ضروریات دینی میں سے نہیں ہے کہ جس میں بولنا ضروری ہو۔ وہ شیفتگی جو ہمیں حضرت مجدّد سے ہے اس کے سامنے دم مارنا مناسب نہیں۔ کیونکہ بات عقل کی حدوں سے گزر گئی ہے ؎

ہرگز در بیش و کم نمی باید زد	از حد بیروں قدم نمی باید زد
(بیش و کم کی فکر میں ہرگز نہیں پڑنا چاہیے)	(اپنی حد سے باہر قدم نہ رکھنا چاہیے)
عالم ہمہ مرآت جمال ازلی است	می باید دید و دم نمی باید زد
(یہ تمام عالم جمال ازلی کا آئینہ ہے)	(دیکھنا چاہیے دم نہیں مارنا چاہیے)

مخدوما آپ نے تحریر فرمایا ہے. حقائق ممکنات کے مسئلہ میں حضرت مجدّد کا مکشوف یہ ہے کہ واحدیت کے مرتبہ میں جو خانہ علم الٰہی میں کمالاتِ الٰہیہ کی تفصیل سے عبارت ہے، ہر صفت کمال کے مقابلے میں اس صفت کے عدم اضافی نے ثبوت اور تمایز پیدا کیا ہے۔ جیسے علم کی صفت کے مقابلے میں عدم العلم جسے جہل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ اور وہ متمایز کرنے والے اعدام آئینوں کے مقابلے کی وجہ سے ان صفات کے انوار یا پرتو بن گئے ہیں اور تعینات عالم کے مبادی اور ممکنات کے حقائق بن گئے ہیں۔ یہ اعدام ان حقائق کے مواد کی جگہ ہیں اور ان میں عکوس اور ظلال صور حالہ کی جگہ ہیں۔ اسی وجہ سے ممکنات کے اعیانِ خارجیہ ان حقائق کے مہبط (مرکز) پر مصدرِ آثار ہوئے ہیں۔ وجود اور عدم دونوں قبول کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے خیر و شر کے مصادر ہوتے ہیں اور حضرت مجدد کا بھی مکشوف ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السّلام والصلوٰۃ کی تعینات کے مبادی صفات ہیں کہ ظلال مذکورہ کے اصول ہیں اور وجود وجوبی رکھتے ہیں اس لئے چاہیے کہ ان حضرات کے حقائق میں عدم داخل نہ ہو۔ حالانکہ یہ حضرات بھی ممکنات میں سے ہیں۔ اور آپ کی تحقیق کے مطابق ممکن کی حقیقت بے خلط عدم نہیں ہوتی تو پھر تطبیق کی وجہ کیا ہے۔ مخدوما!

چونکہ علم الٰہی میں وجوداتِ صفاتِ مقدسہ اور اعدام متمائزہ کے درمیان مقابلہ اور محاذات مقرر ہیں اس لئے جس طرح اعدام آئینہ صفات ہو گئے ہیں صفات بھی ان اعدام کے آئینہ ہو گئے ہیں۔ لیکن یہاں معاملہ الٹا ہے کہ صفات مادے کی جگہ اور اعدام صورِ حالہ کی بجاتے ہیں۔ اس صورت میں جہت عدم حقیقت اور جہتِ وجود قوی ثابت ہوتی ہے اور اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں اور ان سے شر کا صدور نہیں ہوتا لیکن ان کا خارجی وجود عدم اور وجود دونوں کو قبول کرتا ہے۔ امکان کا ثبوت دینے کے لئے ان حضرات کے حقائق میں عدم کا اتنا دخل کافی ہے۔ والسّلام۔

۹

آپ نے پوچھا تھا کہ جب تک صوفی خود کو کافر فرنگ سے بدتر نہ سمجھے کافر کافرِ فرنگ سے بدتر ہے۔ یہ بات کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے؟ کیونکہ صوفی البتہ مومن ہے اور کبھی عالم اور متقی بھی ہوتا ہے۔ صحو اور افاقت کے عالم میں اپنے اوصاف اور اعراض کا علم بھی رکھتا ہے اور ایک ہی نوع کے افراد میں ایک فرد کی دوسرے فرد پر فضیلت کا انحصار انہیں اوصاف اور اعراض پر ہے نہ کہ ذات اور حقیقت پر۔ اس لئے اس علم کے باوجود کہ کافرِ فرنگ کفر و معاصی سے منصف ہے اور اس علم کے باوجود کہ صوفی ایمان اور فضائل سے بہرہ ور ہے کس طرح خود کو اس سے بدتر سمجھ سکتا ہے اور اگر تکلفاً ایسا کرتا ہے تو ان فضائل کو اس کے رذائل سے برا سمجھتا ہے اور عقلاً و شرعاً اس عقیدے کی خرابی ظاہر ہے۔ مخدوما! حضرات مجددیہ کے مصائب میں حقائق ممکنات مرکب ہیں اعدام اضافیہ اور صفات حقیقت کے ظلال سے۔ یعنی اعدام نے علم الٰہی میں اسماء و صفات کے تقابل کی وجہ سے علم الٰہی میں ثبوت پیدا کر دیا ہے اور اسماء و صفات کے انوار کے آئینے بن کر تعینات عالم کے مبادی ہو گئے ہیں، اور خارج ظلی میں کہ ظل خارجِ حقیقی ہے خدا کی قدرت سے وجود ظلی میں موجود ہیں۔ اور اس ترکیب کی وجہ سے آثارِ خیر و شر کے مصدر ہوئے ہیں۔

عدمِ ذاتی کی وجہ سے کسبِ شر کرتے ہیں اور وجودِ ظلی کی وجہ سے کسبِ خیر۔
یہ کوئی چھپی بات نہیں ہے کہ عالم جس میں جب کوئی شخص سورج کی روشنی سے
لبریز آئینہ کو دیکھے تو پہلے اسی روشنی کو دیکھتا ہے نہ کہ آئینے کو۔ کیونکہ آئینہ تو
انوار کی کرنوں سے مستور ہوگیا ہے۔ اور ذات پر نگاہ کرے گا تو اولاً اس تعین مرآتی
کو دیکھے گا نہ کہ انوار کو کیونکہ اس کی نظر ظاہر پر نہیں ہے ۔ اس لئے صوفی کی نظر
ان شریفہ اور خسیسہ مظاہر پر پڑتی ہے اس وجود کی وجہ سے جو اس میں ظاہر
ہونے والا ہے خیر ہوا ہے اور جب خود کو دیکھتا ہے تو اس کی نظر اپنے عدم
ذاتی کی جہت پر پڑتی ہے جو منشاء شر ہے ۔ خود کو خیر و کمال سے مطلقاً عاری
پائے گا ۔ اور وہ خیر و کمال جو اس نے وجود سے عارتیاً حاصل کئے ہیں۔ ان میں
اپنا پن پائے گا ۔ اس لئے مجبوراً خود کو کافر فرنگ اور دوسری اشیاء خسیسہ
سے بدتر سمجھے گا۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کے کہنے والے کا مطلب یہ
ہے کہ وہ کامل صوفی کبھی اپنی طرف خیر و کمال کو منسوب نہیں کرتا اور انھیں
مستعار سمجھتا ہے ۔ فنائے تام اور مشہودِ صحیح کے حاصل ہونے کے معنی بھی
یہی ہیں ۔ اگر صوفی کی نظر اپنے جہتِ وجود اور اپنے مستعار انوار پر پڑتی ہے
اور اس کی جہت مرآتیت جو کہ عدم ہے مستور ہو جاتی ہے تو پھر وہ انا الشمس کا
دعویٰ کر دیتا ہے اور حضرت حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کے "انا الحق" کہنے کا
یہی راز ہے ۔ اگرچہ وہ اسے دیکھنے سے معذور تھے لیکن دیکھنے میں خطا کی
اور سکر کے غلبہ کی وجہ سے جہتِ عدم اور جہت وجود میں تمیز نہ کر سکے۔
اور اس راستے کے بہت سے سالکوں سے ایسی غلطی واقع ہو جاتی ہے۔ الا من عصمہ اللہ
تعالٰی ببرکۃ حبیبہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم (سوائے اس شخص کے جسے
خدا اپنے حبیب کی برکت سے محفوظ رکھے)

۱۰

آپ نے لکھا تھا کہ ایک بزرگ حضرتِ ایوب علیہ السلام کی طرح ایک بڑی بلا میں گرفتار ہوئے۔ ایک اور بزرگ ان کی عیادت کو گئے اور پوچھا کہ کیا حال ہے؟ جواب دیا حال تو ظاہر ہے لیکن میں نے ابھی تک رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ (اے خدا تکلیف نے مجھے گھیر لیا ہے) نہیں کہا۔ اور ہرگز عاجز نہیں آیا۔ ایسی صورت میں اس بزرگ کا مقامِ صبر حضرت ایوبؑ کے مقامِ صبر سے بلند معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ مقامِ صبر بہت رفیع ہے اس لئے اس ولی کی فضیلت اس نبی پر لازم آتی ہے۔ لیکن یہ بات خلافِ اجماع ہے۔ جواب مخدوما! بظاہر تو یہ شبہ وارد ہوتا لیکن اگر غور کرو تو شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت ایوبؑ نے تو کہا تھا رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ۔ (اے خدا مجھے مصیبت نے گھیر لیا ہے اور تو رحیم و کریم ہے) اور نیز یہ کہا تھا کہ رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطَانُ بِنُصُبٍ وَّعَذَابٍ (اے خدا شیطان نے مجھے مصیبت و عذاب میں گرفتار کیا ہے) بظاہر یہ آیات بے تابی اور بے صبری کی دلیل ہیں۔ لیکن خدا جو پوشیدہ باتوں اور دلوں کا جاننے والا ہے فرماتا ہے۔ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ (ہم نے اسے صابر اور اپنے بندوں میں اچھا پایا۔ وہ بے شک ہماری طرف رجوع کرنے والا ہے) اس لئے معلوم

ہوا کہ ان کی یہ بے صبری بھی صبر کا ایک لطیف پہلو رکھتی ہے۔ ورنہ خدا بے صبری کے باوجود ان کے صبر کا اقرار نہ کرتا۔ اس کا راز یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ کا نفس شریف مدتوں طرح طرح کے مصائب و آلام مثلاً اولاد و اموال کی ہلاکت، مرض کی شدت، فقر، لوگوں کی ان سے اور ان کے ساتھیوں سے نفرت اور حقارت پر صابر رہنا اور جب نزولِ رحمت کا وقت قریب آگیا اور انھیں یہ محسوس ہوا کہ ان مصیبتوں کا کشف آہ و زاری پر منحصر ہے اور اس وقت بے صبری کا اظہار یہی ادب ہے تو وہ مقام صبر سے ترقی کر کے مقام رضا میں پہنچے اور آہ و زاری کرنے لگے۔ اس ادب کے صلہ میں نعم العبد بنے اور انہ اوّاب (تحقیق ہو کہ وہ ہماری طرف رجوع کرنے والا ہے) کے منصب کا خلعت پایا، کیونکہ اوّاب مشتق ہے اوب سے جس کا مطلب ہے "رجوع"۔ یعنی اتنے سال کے صبر کی وجہ سے وہ اپنے نفس کی خواہش کی طرف رجوع نہیں ہوئے بلکہ خدا کی مرضی کی طرف رجوع کیا کہ اظہارِ بے صبری اس وقت منظور تھا۔ الحمدللہ خدا نے ان کے صبر کی داد دی۔ اور ظاہری بے صبری کے باوجود ان کے باطن کے حال کو پیشِ نظر رکھ کر ان کے صبر کا اثبات کیا۔ اور فرمایا: اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ (ہم نے اسے صبر کرنے والوں اور اچھے بندوں میں پایا بے شک وہ ہماری طرف رجوع کرنے والا ہے) اور جو کچھ حضرت شیخ اکبر رحمتہ اللہ "فص ایوبی" میں فرماتے ہیں کہ غیر سے شکوہ کرنے سے اپنے نفس کو باز رکھنے کا نام صبر ہے تو حضرت ایوبؑ نے کسی غیر سے شکوہ نہیں کیا۔ اپنا حال خدا کی جناب میں پیش کیا۔ اس لئے صبر ترک نہیں کیا۔ اس شبہ کا جواب پورا نہیں ہوا۔ کیونکہ جب اس ولی نے بھی خدا سے آہ و زاری نہیں کی اور دم نہیں مارا تو اس ولی کے صبر کی فضیلت اس نبی کے صبر پر ہنوز باقی ہے

یہاں مقصد یہ ہے کہ ولی کو نبی پر فوقیت نہ ہو۔ اس بےچارے ولی نے جو
کمالات نبوت کے مذاق سے اور حقیقتِ عبودیت اور کمال مقامِ رضا کی خبر
نہیں رکھتا جو کچھ سکر کے غلبہ میں کہا ہے وہ اس سے معذور ہے۔
والسّلام۔

۱۱

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ کچھ حنفی فقیہوں نے ذکر جہر کے انکار میں غلو کیا ہے۔ اور اس کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ اور بعض محدثین نے یہ ثابت کیا ہے کہ ذکرِ جہر کی نسبت شرعی ہے اور ذکرِ جہر کو ذکرِ خفی پر فضیلت دی ہے۔ میرے خیال سے دونوں فریق افراط و تفریط کا شکار ہیں اور انصاف کی بات نہیں کہتے۔ یہ مقام تنقیح طلب ہے اور محاکمہ چاہتا ہے۔ جاننا چاہیے لفظ ذکر کے معنی ہیں یاد کرنا۔ اس کی تین قسمیں ہیں:۔ ایک ذکرِ لسانی، جس میں آگاہی قلب کی ضرورت نہیں۔ اور یہ بات تو اعتبار سے ساقط اور اقسام غفلت میں داخل ہے۔ دوسرے ذکرِ قلبی ہے۔ یعنی جس میں زبان نہ ہلے۔ اصطلاحِ (صوفیہ) میں اسے ذکرِ خفی کہتے ہیں اور صوفیوں کے مراقبات کی بنیاد اس پر ہے۔ اور تمام طریقوں میں رائج ہے۔ اور اس کی دو قسمیں ہیں کبھی ذات بحت کا حضور مراد ہے، ملاحظہ حقیقت کے بغیر اور کبھی اس کے صفات کے ملاحظہ سے۔ اور یہ اس آیت سے ماخوذ ہے۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ (صبح و شام خدا کا ذکر اپنے دل میں آہستگی و زاری سے کر) دوسرے مذکور کی حضوری چاہتا ہے۔ اس کی نعمتوں اور بخششوں کے منسوبات کا ملاحظہ کر کے مؤثر پر اثر کے استدلال کا یہ طریقہ

ہے اور یقین کی زیادتی کے لئے فائدہ مند ہے اور اس کے فضائل کتاب اور سنّت میں بھرے ہوئے ہیں۔ ذکر کی تیسری قسم ذکر قلبی کے ساتھ ذکر لسانی ہے اور ذکر کی تمام قسموں میں یہ سب سے اکمل ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک تو یہ کہ ذاکر ذکر کرنے میں اپنے اسماع نفس پر اکتفا کرے اسی کو شرع کی زبان میں ذکر خفی کہتے ہیں اور یہ ماخوذ ہے اس آیت کریمہ سے ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (خدا کو زاری اور آہستگی سے یاد کرو۔ کیونکہ وہ اعتدال سے بڑھ جانے والوں کو نہیں چاہتا) دوسرا ذکر وہ جو دوسرے کو بھی سنائی دے۔ اسے شرع میں جہر کہتے ہیں۔ اور خاص موقعوں پر بعض مصلحتوں کی وجہ سے جہر کو خفی پر افضلیت ہے لیکن مطلق افضل نہیں ہے۔ جیساکہ صلوٰۃ جہریہ میں اذان، اقامت اور قرأت جہر سے پڑھنا، کیونکہ اس سے مراد سوتے ہوئے لوگوں کو جگانا اور غافلوں کو تنبیہ کرنا ہے۔ ذکر خفی میں یہ حکمت ہے کہ نفسِ عمل سمع اور ریا سے پیدا ہونے والے فساد سے محفوظ رہتا ہے جو قبول عام میں مانع آتا ہے اور ذکرِ خفی کی ذکر جہر پر فضیلت کتاب اور سنت سے ثابت ہے۔ بلکہ اس حدیث کے مطابق تو ذکر جہر سے منع کیا گیا ہے: انکم لا تدعون اصما ولا غائباً۔ (تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں بلا رہے) مخصوص کیفیات کے ساتھ ذکر جہر اور مراقبات اطوار معمولہ کے ساتھ جو قرونِ متاخرہ میں رواج پا گئے تھے کتاب اور سنت سے ماخوذ نہیں ہیں۔ بلکہ حضرات مشائخ نے الہام اور اعلام کے طور پر مبدا فیض سے حاصل و اخذ کیا ہے۔ اس معاملے میں شرع خاموش ہے۔ یہ دائرۂ اباحت میں داخل ہے اور اس میں فائدہ یقینی ہے۔ اور انکار کرنا ضروری نہیں۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ جو چیز کتاب اور سنت سے

ثابت ہے۔ وہ اس چیز سے بہتر ہوگی جو کتاب وسنت میں نہیں خواہ مؤخرالذکر مباح اور کسی وجہ سے بھی مفید ہو۔ شداد بن اوس کی روایت سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو جہر سے کلمۂ طیّب کے ذکر کی تعلیم دی، وہ اوسط درجہ کا ذکر ہوگا نہ کہ اس قسم کا جہر جیسا کہ صوفیاء کا معمول ہے۔ کیونکہ اس روایت کے شروع میں ہے کہ آنحضرت نے پہلے دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ بات فی الجملہ اخفاء کا اشارہ کرتی ہے۔ گفتگو جہر کے جواز اور عدم جواز میں نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کی فضیلت میں ہے۔ اس لئے ذکر جہر کو مطلقاً ذکر خفی پر فوقیت دینا نصوص سے انکار کرنے کے مرادف ہے۔ اور ذکر جہر کی تمام اقسام سے منکر ہونا بھی ایسا ہی ہے۔ بعض موقعوں پر جہر کی شرعی حیثیت ہے۔ ذکر خفی میں مراقبات معمولہ کا مسنون ہونا ثابت ہے اور اس ذکر جہر کی مشروعیت جو متاخرین میں رائج ہے ثابت کرنا ممکن نہیں۔ چہ جائیکہ اس کی فضیلت ثابت کی جائے۔ اور دونوں فریقوں میں جو لوگ مکابرہ کرتے ہیں یہ لائق التفات نہیں اور افراط وتفریط تو ہر کام میں بری ہے اعتدال اچھا ہے۔ بہترین کلام وہ ہے جو مختصر اور مدلل ہو۔ والسلام

علی من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفٰے علیہ التحیۃ والثناء۔
(سلامتی اس پر جس نے ہدایت کا اتباع کیا اور محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو خود پر لازم کیا)

مخدوما! سماع کے مسئلہ میں ائمۂ فقہا اور حضراتِ صوفیہ میں سخت اختلاف ہے۔ پہلا فرقہ فتنہ و فساد کے دروازے کو بند کرنے کی مصلحت سے کہتا ہے کہ سماع قطعی حرام ہے۔ دوسرا فرقہ غلبۂ ذوق کے اقتضاء سے اسے مطلقاً حلال بتاتا ہے۔ انصاف کی اور اصل بات تو یہ ہے کہ سماع دو طرح کا ہوتا ہے: ایک تو وہ کہ کوئی شخص جو محلِ فتنہ نہ ہو موزوں کلام کو موزوں آواز میں محذورِ شرعی کی مداخلت کے بغیر گائے اور سننے والوں کو باطن میں اس سے کوئی فساد پیدا ہونے کی بجائے ان کے دل میں خوشی یا حزن و ملال پیدا ہو۔ سماع کی یہ قسم البتہ مباح ہے۔ کیونکہ یہ مرکب ہے دو مباح چیزوں سے: کلام موزوں اور آوازِ موزوں سے، تو پھر کس لئے یہ غیر مباح ہو۔ اور نیز قرنِ اول میں شرعی تقریبات مثلاً: نکاح یا ولادت کے موقعوں پر یہ اکابر کا معمول رہا ہے۔ اور امت کے علماء نے کبھی کبھی ایسا کیا ہے جیسا کہ حدیث کی کتابوں سے ظاہر ہے۔ لیکن ان بزرگوں نے اس عمل کا کوئی التزام نہیں کیا۔ بلکہ محض اتفاقاً ایسا ہو گیا۔ دوسری قسم وہ ہے جسے انتہا پسند متاخرین نے رواج دیا ہے، اس کا التزام کیا

ہے اور بہت سی غیر شرعی چیزوں کو اس میں خلط ملط کر دیا۔ اس قسم کے سماع میں جس قدر مباح امور داخل ہوں گے یہ اتنا ہی حرام ہوگا۔ اور ان حرام کرنے والوں کی اباحت کا احترام کفر تک پہنچ جائے گا۔ اور ارباب کمال میں سے بعض لوگ سماع مباح کی رغبت نہیں رکھتے تو یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ شرعی احکام پر منحصر نہیں ہے۔ مثلاً شراب پینے والا میٹھی چیز کو پسند نہیں کرتا۔ اور افیون کھانے والا نمکین چیز سے رغبت نہیں رکھتا حالانکہ ان میں سے ایک شخص دوسرے کی نقل کو حرام نہیں کہتا۔ اسی طرح چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کا نسبت کا نشہ شراب کے نشہ کی طرح ہے۔ وہ سکوت کی بجائے شورِ نغمات سے لطف لیتے ہیں اور نقشبندیہ طریقے کے بزرگ کہ جن کی خدا سے نسبت افیون کے نشہ کی طرح ہے شور اور ہنگامے کے بجائے سکوت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ ذوق اور طبیعت ہے نہ کہ دین اور شرع۔ تمام طریقوں کے بزرگ دین اور ملت کے تابع ہیں نہ کہ حرص و ہوا اور خواہشوں کے۔ اور سب غیر مباح سے اجتناب کے سلسلے میں متفق ہیں۔ اور طرفین کے جاہل قابلِ اعتبار نہیں۔ اور افراط و تفریط ممنوع ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے امام حجت الاسلام غزالی اور شیخ الشیوخ سہروردی وغیرہ جیسے محققین کی مبسوط کتابیں دیکھنی چاہئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ بندہ سماعِ غیر مباح سے تائب اور سماع مباح کو ترک کر چکا ہے اور اباحت اور غیر اباحت کے عقیدہ کے سلسلے میں کتاب اور سنت کا تابع ہے اور ذوق و وجدان کے متعلق اس سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس گروہ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ صحیح احوال اور بلند مقامات والے لوگوں نے سماع مباح میں اپنی جانیں دے دی

ہیں اور جو علمائے صوفیہ کے مذاق سے واقف ہے اور صحیح ذوق اور عقل سلیم رکھتا ہے وہ اس تحریر کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ اور بس، خیر الکلام ما قلّ و دلّ۔ (بہترین کلام وہی ہے جو مقدار میں کم ہو لیکن معنی زیادہ رکھتا ہو)

والسّلام۔

مخدوما! جبر و اختیار کے مسئلہ میں علماء نے بہت سی باتیں کی ہیں لیکن ہنوز تشویش خاطر باقی ہے۔ کیونکہ بعض مقدمات دینی کو سمجھنے کے لئے عقل کافی نہیں ہے ورنہ انسانی امور کی اصلاح کے لئے وحی نازل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ جاننا چاہیئے کہ مستقل اختیار یا جبر محض کے دعوے کا مطلب کتاب اور سنت سے انکار کو متلزم ہے۔ کیوں کہ بندوں کے اعیان کی طرح ان کے اعمال بھی نصِّ جلی (قرآن شریف) کے مطابق خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں پھر مکمل اختیار کہاں ہوا؟ اور مجبور انسان سے مؤاخذہ کرنا محض ظلم ہے اور عقل و شرع کے مطابق خدا سے ظلم ممکن نہیں پھر جبر محض کس لئے؟ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے افعال حرکات کی طرح مرتعش نہیں ہوتے بلکہ علم، ارادہ اور قوت کے ساتھ چلتے ہیں اور یہی اختیار کا حصہ اور فعل اختیاری کا مطلب ہے۔ لیکن ان تینوں قوتوں کا ظاہر ہونا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ جب بھی خدا چاہتا ہے انھیں دیدیتا ہے اور یہی حصۂ جبر اور فعل اضطراری کا مطلب ہے۔ اور چونکہ اختیار تام اور جبر محض متحقق نہیں ہوا اس لئے یہ امر متوسط ہے۔ جیسا کہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے سوال پر دیا تھا:

لاجبر و لا تفویض ولکن امر بین امرین (نہ جبر ہے نہ اختیار، دونوں امر کے درمیان ایک امر ہے) اور شرع میں اس امر متوسط کو لفظ کسب سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور فعلِ عباد کے علاوہ اس لفظ کا اطلاق کہیں اور نہیں کیا جاتا۔ اس لئے معلوم ہوا کہ ہمارے افعال جبر اور اختیار کا مجموعہ ہیں۔ اور اسی اختیار ضعیف پر تکلیفات (شرعی) کا انحصار ہے۔ اور بندوں کے اختیار کے ضعف کی وجہ سے ہی رحمت کو غضب پر سبقت دی ہے۔ حالانکہ خدا کی صفات میں سے کوئی صفت دوسری صفت پر سبقت نہیں رکھتی۔ اور جب خدا کے افعال ہمیشہ علم، ارادہ اور قدرت کی وجہ سے ہیں اور افعال عباد میں ان تین صفات کی مسبوقیت کی وجہ سے ایک طرح افعال خداوندی سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اور حرکات اضطراری جو مجبورِ محض ہیں (صفات خداوندی سے) مناسبت نہیں رکھتیں۔ اگر محاسبہ ان افعال کی طرف توجہ کرے تو یہ انصاف کے منافی نہیں ہے اور طریقہ صوفیاء کے مطابق حصہ اختیار کو اس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک ذرّات کائنات میں سے ہر ذرہ میں اپنے تمام کمالات کے ساتھ خدا کا وجود ہے، یہ ظہور جزوی نہیں بلکہ ہر ذرہ میں کل کا ظہور ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کا وجود بسیط حقیقی ہے، اس کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہتے ہیں۔ کل شی فیہ کل شیٔ (ہر چیز میں ہر چیز ہے) اور چونکہ اختیار بھی صفات و شیون باری تعالیٰ سے ایک صفت اور ایک شان ہے پس یہ لازم ہوا کہ مظاہر کائنات کے ہر مظہر میں، خصوصاً انسان میں جو منصب خلافت سے مشرف ہے کچھ حصہ اختیار کا بھی متحقق ہو اور تکلیفات امر و نہی کی بنیاد اسی پر ہو والسلام علی من اتبع الھدیٰ و الصلوٰۃ علی خیر الوریٰ (اور سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی اور خیر الوریٰ پر درود و سلام)۔

۱۴

تم نے پوچھا تھا کہ کفّارِ ہند بھی مشرکینِ عرب کی طرح بے اصل دین رکھتے ہیں یا اس دین کی کوئی اصل تھی جو بعد میں منسوخ ہوگئی۔ اور ان کے (کفارِ ہند) کے پیشروؤں کے بارے میں کیا اعتقاد رکھنا چاہیئے۔؟ مختصر الفاظ میں تحقیق اور انصاف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ اہلِ ہند کی پرانی کتابوں سے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی پیدائش کے آغاز میں رحمتِ الٰہی نے ان کی دنیا اور عاقبت کی اصلاح کے لئے "وید" نامی ایک کتاب "برہما" نامی ایک فرشتہ (کہ جو دنیا کی ایجاد کا وسیلہ اور آلہ ہے) کے ذریعہ بھیجی تھی۔ یہ کتاب چار دفتر رکھتی ہے اور احکام امر و نہی اور ماضی و مستقبل کی خبروں پر مشتمل ہے۔ ان کے مجتہدوں نے اس کتاب سے چھ مذاہب نکالے ہیں۔ اور اصول عقائد کی بنیاد اس پر رکھی ہے۔ اس فن کو دھرم شاستر کہتے ہیں۔ یعنی فن ایمانیات، جیسے ہم علم کلام کہتے ہیں۔ نوعِ انسان کو چار فرقوں میں تقسیم کیا ہے اور اس کتاب سے چار مسلک نکالے ہیں۔ ہر فرقے کے لئے ایک مسلک مقرر کیا ہے اور فروغِ اعمال کی بنیاد اس پر رکھی ہے۔ اس فن کا نام "کرم شاستر" ہے۔ یعنی فنِ عملیات، جیسے ہم علم فقہ کہتے ہیں۔ چونکہ وہ لوگ

فسخ احکام سے انکار کرتے ہیں اور ہر دور اور زمانہ کے اہلِ دانش کی طبیعتوں کے مطابق تبدیلی لازمی ہے۔ دنیا کی طویل عمر کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصہ کا نام "جگ" رکھا ہے اور ہر جگ کے لئے چاروں دفتروں سے طورِ عمل اخذ کیا ہے۔ اور جو کچھ ان کے متاخرین نے تصرفات کئے ہیں وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ اور ان کے تمام فرقے خداوند تعالیٰ کی توحید پر متفق ہیں اور دنیا کو حادث ومخلوق جانتے ہیں۔ دنیا کے فنا ہونے، حشرِ جسمانی، اور جزائے اعمالِ نیک وبد پر یقین رکھتے ہیں اور ان لوگوں کو علوم عقلی ونقلی، ریاضات، مجاہدات، تحقیقِ معارف اور مکاشفات پر یدطولیٰ حاصل ہے۔ اور ان کے کتاب خانے آج تک موجود ہیں۔ ان لوگوں میں بت پرستی کی رسم الوہیت میں شرک کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت دوسری ہے۔ ان کے دانشمندوں نے انسانی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے جنھیں اس طرح گزارتے ہیں۔ پہلے حصے میں علوم وآداب کی تحصیل، دوسرے میں تحصیلِ معاش اور اولاد، تیسرے حصہ میں تصحیح اعمال اور اصلاحِ نفس، اور چوتھا حصہ ترک وتجرید کی مشق میں جو انسان کے کمال کی انتہا ہے۔ نجات کبریٰ کہ جسے مہا مکت کہتے ہیں اسی پر موقوف ہے۔ اس دین کے قواعد وضوابط میں مکمل نظم ونسق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ مرتب دین تھا اور اب منسوخ ہوگیا۔ اور شرع میں منسوخ شدہ مذاہب میں سوائے یہود ونصاریٰ کے دین کے اور کسی کا ذکر نہیں، حالانکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے مذاہب منسوخ ہوئے اور بہت سے پیدا ہوئے اور ختم بھی۔ جاننا چاہیئے کہ آیتِ کریمہ کے مطابق: وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ، وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ (کوئی امت ایسی نہیں ہے کہ جس میں رسول نہیں بھیجا گیا ہو) اور دوسری آیت کے مطابق ممالک ہند میں بھی انبیاء

اور رسول بھیجے گئے ہیں اور جن کے احوال ان کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں اور جو کچھ ان کے آثار باقی ہیں ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کمال و تکمیل کے مرتبے تک پہنچ گئے تھے۔ اور رحمت عامہ نے اس وسیع مملکت کے انسانی معاملات کو فراموش نہیں کیا تھا۔ مشہور ہے کہ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلّم کے تشریف لانے سے پہلے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے گئے تھے اور پوری قوم پر اپنے پیغمبر کی اطاعت اور فرماں برداری واجب تھی نہ کہ دوسری قوم کے پیغمبر کی۔ ہمارے پیغمبر کے ظہور کے بعد (جو تمام انسانوں کے لئے بھیجے گئے ہیں اور خاتم المرسلین ہیں اور جن کا مذہب تمام شرقی و غربی مذاہب کو ختم کر دینے والا ہے) جب تک دنیا باقی ہے کسی کو ان کی نافرمانی کی مجال نہیں ہے۔ چنانچہ آنحضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی آمد سے آج تک کہ ایک ہزار ایک سو اسی سال گزرے جو کوئی ان کا معتقد نہ ہوا کافر ہے۔ لیکن اگلے لوگ نہیں (یعنی ظہور اسلام سے قبل کے لوگ) اور چونکہ مذہب اس آیتِ کریمہ کے مطابق ان میں سے کہ جن کے ہم نے قصّے بیان کئے اور ان میں سے کہ جن کے ہم نے قصّے بیان نہیں کئے بہت سے انبیاء کے احوال کے بیان میں خاموشی ہے۔ اس لئے ان کی شان میں خاموش رہنا ہی سب سے بہتر ہے۔ نہ تو ہمیں ان کی پیروی کرنے والوں کے کفر و ہلاک کا یقین لازم ہے اور نہ ان کی نجات پر یقین کرنا چاہئیے۔ اس معاملے میں حسنِ ظن ضروری ہے بشرطیکہ تعصّب درمیان نہ ہو۔ اور اہلِ فارس کے حق میں بلکہ ہر ملک والوں کے حق میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی آمد سے قبل گزرے ہیں اور شریعت کی زبان جن کے بارے میں خاموش ہے یہی عقیدہ رکھنا اچھا ہے اور بغیر کسی قطعی دلیل کے کسی کو کافر کہنا آسان نہیں سمجھنا چاہئیے

اور ان لوگوں کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو اللہ کے حکم سے اس عالم کون و فساد میں تصرّف رکھتے ہیں یا بعض کاملوں کی روحیں جن کا جسموں سے ترکِ تعلق کے بعد بھی اس کائنات میں تصرف باقی ہے یا بعض ایسے زندہ لوگ جو ان لوگوں کے خیال میں حضرت خضرؑ کی طرح زندہ جاوید ہیں ان کے بت بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کے سبب سے کچھ مدت کے بعد صاحب صورت سے ربط پیدا کر لیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر دنیا اور عاقبت کے تعلق سے اپنی احتیاجوں کو پورا کرتے ہیں۔

اور یہ عمل ذکرِ رابطہ سے مشابہت رکھتا ہے جو مسلمان صوفیوں کا طریقہ ہے کہ اپنے پیر کی صورت کا تصور کرتے ہیں اور اس سے فیض اٹھاتے ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ (مسلمان) پیر کا بت نہیں تراشتے۔ لیکن یہ بات کفار عرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ تو بتوں کو اپنی ذات سے مؤثر اور متصرّف کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے تصرف کا آلہ نہیں سمجھتے تھے۔ اور ان کو زمین کا خدا جانتے تھے اور خدا کو آسمان کا۔ یہ الوہیت میں شرک ہے ان کا (کفار ہند) سجدہ کرنا سجدۂ تہنیت ہے، سجدۂ عبودیت نہیں۔

جو ان لوگوں کے مذہب میں ماں، باپ، پیر، اور استاد وغیرہ کو بھی سلام کی جگہ کرتے ہیں اور اسے ڈنڈوت کہتے ہیں اور تناسخ پر اعتقاد رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا۔ والسلام۔

۱۵

آپ نے لکھا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے خطوں میں ایک خط میں رفع سبابہ (نماز میں شہادت کی انگلی اٹھانا) سے منع کیا ہے۔ اور آپ حضرت مجدد سے اتنی محبت کے باوجود رفع سبابہ کو جائز رکھتے ہیں۔ اور محبت کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ اپنے محبوب کا اتباع کرے۔ مخدوما! اللہ تعالیٰ نے کتاب اور سنت کی پیروی انسانوں کے لئے فرض کی ہے، چنانچہ فرماتا ہے وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔ (جب اللہ اور اسکے رسول نے کسی امر کا حکم کر دیا تو پھر مومن مرد اور عورت کے لئے اس کے سوا کسی اور کام میں بھلائی نہیں) اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لا یومن احدکم حتیٰ یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ۔ (تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کی خواہش ان امور کی پیروی کی نہ ہو جنہیں میں لایا ہوں) حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اللہ کے کامل نائب ہیں۔ انھوں نے اپنے طریقے کی بنیاد کتاب اور سنت پر رکھی ہے۔ اور علماء نے رفع سبابہ کے حق میں بہت سے ایسے رسالے لکھے

ہیں جو حنفی فقیہوں کی روایتوں اور صحیح حدیثوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت مجدد کے چھوٹے صاحبزادے حضرت شاہ یحیی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس سلسلے میں رسالہ لکھا ہے اور ایک بھی ایسی حدیث نہیں ملی جس سے نفیٔ رفع ہوتا ہو اور حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کا ترکِ رفع اجتہادی چیز ہے اور وہ سنت جو نسخ نہ ہوئی ہو مجتہد کے اجتہاد سے زیادہ مقدم ہے۔ اور سنت سے انگلی اٹھانے کا ثبوت مل جانے کے بعد اس وجہ سے ترک کرنا کہ حضرت مجدد نے بھی ترک کر دیا تھا معقول بات نہیں ہے۔ خود حضرت مجدد بھی ترک سنت میں بہت زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ اور وہ حنفی مذہب رکھتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:۔ اذا ثبت الحدیث فھو مذھبی واترکوا قولی بقول رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ (جب حدیث ثابت ہو جائے تو وہ میرا مذہب ہے اور پیغمبر کے قول کے مقابلے میں میرا قول چھوڑ دو) اس لئے امید ہے کہ حضرت مجدد اس امر اجتہادی کو ترک کرنے اور صحیح حدیثوں سے اخذ کرنے سے ناراض نہ ہوں گے۔ اور اگر لوگ کہتے ہیں کہ کیا حضرت مجدد کو اپنے وسیع علم کے باوصف یہ معلوم نہیں تھا کہ احادیث سے رفع سبابہ کا ثبوت ملتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ کے زمانے تک ہندوستان میں وہ کتابیں اور رسائل مشہور نہیں ہوئے تھے اس لئے آپ کی نظر سے نہیں گزرے، آپ نے ترک کر دیا ورنہ ہرگز ترکِ رفع نہ کرتے۔ کیونکہ آپ اتباع سنت کے معاملے میں اس امت کے اکابرین میں سب سے زیادہ خواہشمند تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ کشف کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی نہ پاکر آپ نے ترک کر دیا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ کشف طریقت کے معاملوں میں تو

معتبر ہے لیکن احکام شریعت میں حجّت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس خط میں حضرت مجدد نے کشف کا کوئی ادعا نہیں کیا۔ یہ جزوی مخالفت حضرت مجدّد کے قاعدۂ کلی یعنی ترغیبِ اتباعِ سنتِ نبوی کی پیروی کا بین ہے اور بار آور رہو گی۔ والسّلام۔

۱۶

آپ نے حدیث کے مطابق عمل کرنے میں ایک مسلک سے دوسرے مسلک میں منتقل ہونے کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ مخدوما! حدیث کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں شیخ محمد حیات محدث مدنی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کی تلخیص فارسی میں تحریر کی جاتی ہے قال اللہ تعالیٰ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو اس کی پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت۔ (تم میں کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش ان امور کی تابع نہ ہو جنہیں میں لایا ہوں) یہ صحیح حدیث ہے۔ ابوالقاسم بن اسمٰعیل بن فضل اصفہانی نے "کتاب الحجۃ" میں اس کی روایت کی ہے اور "روضۃ العلماء" میں ذکر ہے کہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اترکوا قولی بخبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و قول الصحابہ رضی اللہ عنہم۔ (حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے قول کے مقابلہ میں میرا قول ترک کردو۔ اور امام ابو حنیفہ کا مشہور قول ہے: اذا صح الحدیث فھو مذھبی (حدیث

صحیح میرا مذہب ہے) اگر اطلاع کے باوجود کوئی حدیثِ صحیح پر عمل نہ کرے تو اس نے امام صاحب کے قول کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں میرے قول کو ترک کردو" کی مخالفت کی ہے اور یہ بات کوئی چھپی بات نہیں ہے کہ کسی بھی عالم نے تمام حدیثوں کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ یہ قول کہ آنحضرتؐ کے مقابلے میں میرا قول ترک کردو اس بات کا ثبوت ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے پاس تمام حدیثیں نہیں پہنچی تھیں۔ ان میں سے بعض تو رہ گئیں اور کیوں نہ رہتیں، اہل امت میں خلفائے راشدین جیسے عالم ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہتے تھے۔ ان سے بھی بعض حدیثیں فوت ہوگئیں۔

اس بات کو ہر وہ شخص جانتا ہے جسے فن حدیث میں معرفت حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ امت کے افراد پر اتباع پیغمبر واجب ہے اور ان ائمہ میں سے کسی کا اتباع واجب نہیں۔ اس لئے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ کسی بھی مجتہد کا مذہب اختیار کرے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صحیح حدیث پر عمل کرنے سے انسان امام ابو حنیفہ کے مذہب سے نکل جاتا ہے تو اس کے پاس اپنے دعوے کے لئے جو دلیل ہے اسے پیش کرے۔ البتہ ان مشہور مذاہب میں، ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہونا تفصیل چاہتا ہے۔ امام سیوطیؒ نے ایک رسالہ لکھا تھا جس کا نام "بجزیل المواہب فی انتقال المذاہب" ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں جانا جائز ہے۔ اور امام رافعی اسی کے مؤید ہیں اور امام نوویؒ بھی اسی کے مقلد ہیں اور "روضہ" میں لکھتے ہیں کہ مذاہب کی تدوین کے بعد کیا یہ بات جائز ہے کہ مقلد ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں چلا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ مقلد پر لازم ہے کہ دونوں مذاہب کے مجتہدوں کے مطابق طلب علم کرے اور جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ دوسرا مجتہد زیادہ

جانتا ہے تو جائز ہے۔ بلکہ (انتقال مذہب) واجب ہے۔ اور اگر ہم اسے اختیار دیدیں تو یہ بھی جائز ہے۔ اور مقلد کی بھی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ عقل کا حصہ بھی چار چیزوں سے خالی نہیں ہے کیونکہ مقلد جاہل یا عالم۔ ان دونوں کے انتقال مذہب کی وجہ دینی ہے یا دنیوی۔ اس لئے اگر جاہل ہے اور فقہ سے واقف نہیں ہے اور اپنے مذہب کے متعلق سوائے نام کے کچھ نہیں جانتا اور صرف مال وجاہ حاصل کرنے کے لئے مذہب بدلتا ہے تو اس کی یہ حرکت چھچھورپن ہے۔ اور اگر عالم اور فقیہ ہو اور صرف دنیاوی مقصد کے لئے مذہب بدلتا ہے تو یہ بات بہت سخت ہے کیونکہ وہ دنیاوی غرض کے لئے مذہب سے کھیل کرتا ہے اور یہ ناجائز ہے۔ اور اگر خود فقیہ ہے مذہب بدلنے کی وجہ دینی اسباب ہیں اور دوسرا مذہب اس کی نظر میں قوی دلیلوں کے ساتھ ترجیح رکھتا ہے تو ایسے شخص پر انتقال واجب ہے اور ایک روایت کے مطابق جائز ہے۔ اور اگر فقہ سے واقف نہیں ہے اور اپنے مذہب میں منتقل کیا ہے اور جاہل رہا ہے اور دوسرے مذہب کو اپنے لئے زیادہ آسان اور جلد سمجھ میں آنے والا سمجھتا ہے اور دوسرے مذہب میں فقہ کی حیثیت حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے تو ایسے شخص کے لئے بھی انتقال واجب ہے۔ کیونکہ مذہب میں تفقہ جہل سے بہتر ہے۔ کیونکہ کسی ایک مذہب میں مرتبہ متفقہ حاصل کرنا تمام مذاہب کے جہل سے بہتر ہے۔ غالباً جاہل کی عبادت بھی صحیح نہیں ہوتی۔ اور اگر انتقال کا کوئی دینی یا دنیوی مقصد نہیں ہے بلکہ محض عمل کی وجہ ہے تو عام آدمی کے لئے جائز ہے۔ لیکن فقیہ کے لئے ممنوع ہے کیونکہ اس نے ایک طویل مدت میں اس مذہب کا فقہ حاصل کیا ہے۔ اب اگر دوسرے مذہب میں جائے گا تو پھر ایک عمر چاہیئے کہ اس مذہب کا فقہ حاصل کیا جائے۔ اور عمل جو اصل مقصد ہے نہ ہو سکے گا۔ اس لئے اس کے لئے

مذہب تبدیل نہ کرنا سب سے بہتر ہے۔ اور یہ جو کہتے ہیں کہ، اگر کوئی غیر حنفی حنفی مذہب میں آئے تو جائز ہے اور حنفی مذہب کا دوسرے مذہب میں جائے تو ناجائز۔ یہ صرف تعصب کی وجہ سے ہے، اس کی کوئی دلیل تو ہے نہیں۔ کیونکہ حقیقت میں تو سب امام برابر ہیں اور اگر حنفی مذہب یا کسی اور مذہب کی تقدیم کے بارے میں کوئی آیت یا حدیث وارد ہوتی تو اس مذہب کی تقلید امت کے ہر فرد پر واجب ہوتی اور دوسرے مذہب کی تقلید ناجائز ہوتی اور یہ بات اجماع کے خلاف ہے اور صاحب جامع الفتوی حنفی مذہب کے ماننے والے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کا شافعی مذہب سے حنفی مذہب میں جانا یا حنفی مذہب سے شافعی مذہب میں جانا جائز ہے۔ لیکن یہ تبدیلیٔ مذہب کلی طور پر اختیار کی جائے نہ کہ صرف چند مسائل میں۔ بزرگوں میں سے بہت سے حضرات نے انتقال مذہب کیا ہے۔ اگر جائز نہ ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتے، اور جو کوئی اس کے خلاف کہے اس کا قول بے دلیل اور غیر معقول ہے۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ (ہدایت کی پیروی کرنے والے پر سلامتی ہو۔)

والسّلام

۱۷

آپ نے لکھا تھا کہ حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان اموی صحابی، ان کے معاونین اور تابعین کے بارے میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے۔ جاننا چاہیئے کہ مذہب اہل سنت کے علماء صحابہ کے آپس میں اختلاف کے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں جو خیر القرون کے لئے لازمی ہے۔ اور اگر تاویل کے لائق نہ ہو تو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ برا بھلا کہنے اور طعن و تعریض کرنے کو ممنوع سمجھتے ہیں کیونکہ تینوں زمانوں کے عالم، محدث اور مجتہد قرب زماں کی وجہ سے اصحاب کے حالات سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے اس کا اقرار کیا ہے کہ حضرت علیؓ کے مخالفوں نے خطا کی۔ لیکن پھر بھی کسی نے ان پر لعن طعن کی تجویز نہیں کی۔ اگر کچھ دن شام اور کوفہ کی فوجوں نے آپس میں جنگ کی اور باہم تبرّا کیا تو یہ شدت تعصب کی وجہ سے تھا نہ اس لئے کہ وہ ایک دوسرے کو کافر سمجھتے تھے۔ اس تعصب کا ذکر معتبر کتابوں میں موجود ہے۔ اس فتنہ و فساد کی وجہ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ہوئی۔ اور طریقہ اسلام یہی ہے۔ کیونکہ جھگڑے کے وقت جو صحابہ فوج میں تھے وہ تین حصوں میں بٹ گئے تھے۔ پہلا فرقہ خلیفۂ برحق حضرت علی بن ابی طالب

رضی اللہ عنہ کی طرف ہوگیا اور دوسرے فرقے نے امیر شام کی حمایت کی تیسرے فرقے نے توقف کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کے محدثوں اور مجتہدوں نے حدیثیں اخذ کرنے میں ان تینوں فرقوں کی روایتوں پر بھروسہ کیا ہے۔ اگر تینوں فرقوں میں سے کسی ایک کو کافر یا فاسق سمجھتے تو اس فرقے کی روایات کو قبول نہ کرتے اور اجتہاد و استنباط کی بنیاد اس فرقہ پر نہ رکھتے۔ اگر ان پر لعن طعن کریں تو ملّتِ دین اسلام برہم ہو جائے۔ اس لئے حکمتِ دینی اسی میں ہے کہ انھیں برا بھلا کہنے سے زبان کو روکا جائے۔ اور صحبتِ خیر البشر علیہ الصلوٰۃ (آنحضرت ؐ) کی حرمت اس پر مزید ہے۔ اگر مخالف یہ کہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی لوگوں کا احترام اور ان کی رعایت زیادہ ضروری ہے تو یہ بات بھی قبول ہے۔ اہل قرابت کی طرف سے ان مخالفوں کی صریح تکفیر ثابت نہیں ہے۔ اور وحشت و نفرت جھگڑے کے لئے خود لازمی ہیں اس لئے خیر القرون والوں سے ایسی غلطیوں کا ثابت ہونا مستبعد ہے اور اس میں اکراہ کا پہلو ہے چاہے وہ خطائے اجتہادی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ آنحضرت ؐ کے قریبی لوگوں کی محبت امت کے تمام افراد پر واجب ہے اور اگر استکراہ درمیان میں نہ ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل قرابت کی اذیت میں راضی ہونا لازم آتا ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ بحث مناسب نہیں ہے اس موقع پر خاموشی اور مکمل افسوس بہتر ہے۔ چونکہ شیعہ فرقہ نے مسلک اعتدال سے انحراف کر لیا ہے۔ بے اصل حدیثوں پر اعتماد کرتے ہیں، ان پاک نفسوں کو اپنے خبیث نفوس کے مطابق قیاس کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان صحابہ کرام رضؓ کی تکفیر میں مبتلا ہو گئے ہیں جو تواتر حدیث کے مدار ہیں اور کتاب و سنت کے نقل کرنے والے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ ایسا پیغمبر

جس پر خدا نے نبوت ختم کردی ۔ اسے تمام انسانوں کا سردار بنایا اور اس
کے دین کو تمام دینوں کا ناسخ بنا کر قیامت تک باقی رکھا اور جس کی شان میں
نازل ہوا ہے کہ: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (ہم نے تمہیں ساری
دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے) وہ گروہ جو عہد نبوت میں ان کی صحبت
میں رہا ہو اور جس نے ان کی زندگی میں جان و مال خرچ کرنے اور ان
وفات کے بعد شریعت کے پھیلانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھو ۔ وہ رسول
کی دستگیری سے کفر کے گرداب سے بھی نہ نکل سکے اور ساحل نجات تک
نہ پہنچے (یہ لوگ) خدا اور اس کے رسول کے بارے میں عجیب حسن ظن
رکھتے ہیں ۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہی ہو جیسا کہ وہ سابقین کے بارے میں
گمان کرتے ہیں تو ایسے خدا سے بعد میں آنے والوں کو کیا توقع ہوسکتی ہے۔
سابق پیغمبروں اور ان کی امتوں کے حالات پوشیدہ نہیں ہیں اور اس قوم
کے ولیوں کے واقعات بھی چھپے ہوئے نہیں ہیں ۔ ہرگز سننے اور دیکھنے
میں نہیں آیا کہ ان بزرگوں میں سے کسی کے انتقال کے بعد اس کے تمام مخلص
مرتد اور منکر ہو گئے ہوں اور اس کی آل اولاد سے دشمنی کی ہو۔ ایسی صورت
میں پیغمبر کی بعثت سے جسکا مقصد قوم کی اصلاح ہوتا ہے۔ کیا فائدہ ؟
خیر القرون اس حساب سے تو شر القرون بن گیا ۔ اور خیر الامم شر الامم ہو
گئے ۔ خدا انصاف نصیب کرے۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ (نیک
راستے پر چلنے والے پر سلامتی ہو۔)

۱۸

بعد حمد و صلوٰۃ! آپ نے لکھا ہے کہ صحابہ اور اہل بیت کے بارے میں جو شیعہ اور سنی لوگوں میں اختلاف ہے اس سلسلہ میں دل کو سکون نہیں ملتا کیونکہ اہلِ ملت کے اعتقاد کی بنیاد احادیث پر ہے اور احادیث میں جھوٹ اور سچ دونوں کا احتمال ہے اور ایسی حدیث جو متواتر ملتی ہو جس سے کسی بات کا یقین ہو جاتا ہے اس سلسلے میں بہت کم ملتی ہے۔ پھر اطمینان حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟۔

مخدوما! یہ مسئلہ ضروریاتِ دین اور ارکانِ ایمان میں سے نہیں ہے۔ نجات کے لئے توحید الٰہی اور تصدیقِ نبوت کافی ہے اور ایمان مجمل نجات دلانے والا کلمۂ طیبہ کے مضمون کی تصدیق اور اقرار کرنے سے آدمی مسلمان ہو جاتا ہے اور یہی کافی ہے صحابہ اور اہلِ بیت کی شان میں مجمل حسنِ ظن رکھنا چاہیئے۔ چونکہ یہ حضرات آنحضرتؐ کی صحبت میں رہے تھے اور ان کی خدمت کی تھی اور انھیں آنحضرتؐ سے قرب رہا تھا اس لئے ان سے محبت کرنی چاہیئے۔ بس یہی کافی ہے۔ ان حضرات کے حالات کی تفصیل کے لئے تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ موجب فساد و فتنہ ہے کیونکہ عصمت کا منصب اہل سنت کے مذہب سے مخصوص ہے۔ حضراتِ انبیاء کے لئے مسلم ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور کے لئے

ممنوع ہے چاہے وہ صدیق اور ولی ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لئے ان میں کبھی کبھی مخالفت ہوتی ہے وہ بھی بہت جلد دور ہو جاتی ہے اور حد درجہ صاف باطن ہونے کی وجہ سے تصفیہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ نفوسِ خبثیہ ان اکابر کو خود پر قیاس کر کے ان کے آپس کے کینہ و عداوت کو مستقل ثابت کرتے ہیں اور اس میں شاخیں نکال کر رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ اس طبقہ سے انکار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے وجودِ مبارک کی تاثیر سے انکار کیا جائے اور پیغمبر کے دنیا میں بھیجے جانے کے فائدے سے انکار کیا جائے۔ ایک دن میں اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا اور خدا سے التجا کر رہا تھا کہ ان شکوک کے مہلکات سے مجھے نجات کا راستہ مل جائے۔ فقیر کے باطن پر یہ عبارت وارد ہوئی۔

اٰمنت باللہ کماھو عند نفسہ و برسول اللہ کماھو عند ربہ و بآلہ واصحابہ کماھم عند نبیھم (کہو میں ایمان لایا خدا پر جیسا کہ وہ ہے اور اس کے رسول پر جیسا وہ اپنے رب کے نزدیک ہے اور اس کے آل واصحاب پر جیسا کہ وہ اپنے نبی کے نزدیک ہیں) ظاہر بات ہے کہ یہ مطالب تمام اختلافات سے برتر ہیں۔ یہ امر خدا کے سپرد کر دینا چاہیے۔ یہ نفس الامر کا مرتبہ ہے۔ اس مقام پر کوئی فرقہ دم نہیں مار سکتا۔ الحمد للہ علیٰ نوالہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمدؐ وآلہ (شکر ہے خدا کا اس کی نعمتوں پر اور صلوٰۃ اس کے رسول اور آل واصحاب رسول پر)

۱۹

آپ نے لکھا تھا حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا ہے کہ میرے بعد قریش خاندان سے بارہ خلیفہ ہوں گے۔ اہل سنت کے خیال میں ان بارہ خلفاء میں چار تو وہ ہیں جنہوں نے خلافت خاصہ حاصل کی۔ اور آٹھ وہ مراد ہیں جنہوں نے خلافت عامہ پر تسلّط پایا اور کفّار کے ساتھ جہاد اور کلمۂ حق کی تبلیغ کی ہے۔ اور شیعہ بارہ امام سلام اللہ علیہم کو کہتے ہیں۔ آپ کے خیال سے کون حق بجانب ہے۔

مخدوما! اہل سنت حق بجانب معلوم ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ لفظ "خلافت" عمومیت لئے ہوئے ہے۔ خلافت ظاہری بھی ہو سکتی ہے اور باطنی بھی۔ اور آنحضرتؐ کے خلیفاؤں کے لئے ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی خلافت ضروری ہے۔ خلیفہ اسے کہتے ہیں کہ جو امر خلافت کو چلائے۔ ظاہری خلافت کا چلنا موقوف ہے قدرت اور استطاعت پر۔ یعنی خزانے اور فوجیں ہونا ضروری ہیں۔ کیوں کہ وہ نفاذِ حکم کے لئے شرط ہیں۔ ظاہر ہے کہ چاروں خلفاء کے بعد جنہوں نے تیس سال تک خلافت کی۔ اور حضرت امام حسنؓ نے چھ ماہ تک کی اور ان کے بعد ائمۂ اطہار میں سے کوئی بھی کسی بھی وقت اس امر پر قادر نہ ہوا اور آنحضرت رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیر کہ خلیفہ قریش سے ہوں گے اس بات کی دلیل ہے ۔ اگر
ایسا نہ ہوتا تو آنحضرت قریش کی بجائے اہل بیت یا بنی ہاشم کہتے ۔ اس
وجہ سے دونوں مذہبوں میں اس طرح اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ دین کے
ظاہر کی ترویج جو اسبابِ ظاہر پر موقوف ہے اور اسلام کے قالب کے مرادف
ہے وہ تو ان کے دَم سے ہوئی اور دین کے باطن کی تقویت کہ اسلام کی حقیقت
اس قالب کے روح کی جگہ ہے، ائمۂ اطہار کی وجہ سے ہوئی ۔ اس لئے
صوفیہ اہل سنّت بارہ اماموں کی قطبیت تسلیم کرنے میں متفق ہیں ۔ چاروں
خلفاء اور حضرت امام حسنؓ میں یہ دونوں باتیں جمع تھیں ۔ امیر شام (امیر معاویہ)
اور حضرت امام حسن علیہ السلام کے درمیان صلح کے بعد سے لے کر حضرت امام
مہدی صاحب زماں کی خلافت میں بھی یہ دونوں باتیں یعنی ظاہری اور باطنی
خلافت متحقق ہوں گی ۔ اور دوسرے خلفاء ہیں ظاہری خلافت کے سلسلے میں بارہ
کے عدد کا تعین کرنے میں مجھے تکلّف ہے ۔ والسّلام۔

آپ نے لکھا تھا کہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حضرت عائشہ رض حضرت علی رض سے ناراض تھیں۔ اس کے بعد بھی حربِ جمل کے واقعہ کو چھوڑ کر جس کے اور دوسرے اسباب تھے یہ ناراضگی ثابت ہوتی ہے۔ یہ بات اشکال سے خالی نہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ رض سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ حضرت علی رض سے انحراف کریں۔ حالانکہ خود حضرت عائشہ رض روایت فرماتی ہیں کہ تمام انسانوں میں حضرت فاطمہ رض اور حضرت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔

مخدوما! بعض اوقات لڑائی جھگڑے میں دونوں طرف کے لوگ معذور ہوتے ہیں۔ کیونکہ دونوں برحق ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی بات یہاں پر کھی ہے۔ یہ بات مخفی نہ رہے کہ جب "قضیۂ افک" میں حضرت علی رض نے دیکھا کہ آنحضرت صلعم بہت زیادہ مضطرب ہیں تو حضرت علی رض نے غلبۂ محبت سے مجبور ہو کر اور وقت کی مصلحت دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تسکین اور تسلّی کے ایسے الفاظ کہے جن سے ان کا دل حضرت عائشہ رض سے پھر جاتے۔ جب حضرت

عائشہ رضؓ نے یہ خبر سنی تو بہت پریشان ہوئیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں ایسے وقت میں ہر وقت ساتھ دینے والوں کی ایسی باتوں سے محب اپنے محبوب کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی اذیت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حضرت عائشہ کا حضرت علیؓ سے انحراف غیرت محبت اور انسانیت کے تقاضے کی وجہ سے ہے کہ جس سے کوئی چارہ نہیں۔ یہ انحراف کسی دوسری وجہ سے نہیں تھا۔ اور جب تک محبت باقی ہے یہ وحشت بھی باقی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے یہ باتیں کسی عداوت کی وجہ سے نہیں کہی تھیں۔ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے۔ یہ باتیں صرف آنحضرتؐ کی محبت کی وجہ سے تھیں۔ کیونکہ اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اس لئے دونوں حق بجانب ہیں اور دونوں معذور ہیں۔ بلکہ دونوں کو اجر ملے گا۔ کیونکہ دونوں کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔ چنانچہ حضرت فاطمہؓ زہرا کی حضرت صدیق اکبر سے خفگی اور ناراضگی صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ اس جگہ دو شبہے ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ حضرت فاطمہ ترک دنیا کرنے اور معقول جواب سننے کے باوجود حضرت صدیق اکبر سے کیوں ناراض ہوئیں۔ دوسرے یہ کہ حضرت صدیق اکبر نے اس معمولی سی بات میں آنحضرتؐ کی اولاد (حضرت فاطمہؓ) کی رعایت سے مصالحت کیوں نہ کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وراثت کے مال سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مال حلال نہیں ہے۔ اس کا طلب کرنا ترک دنیا اور تقوے کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ متقی مال حلال کی زیادہ قدر جانتا ہے۔ اور جب تک انسانیت باقی ہے ضروریات سے چھٹکارا نہیں۔ اور حضرت صدیق اکبر کا انکار حدیث کی دلیل پر تھا۔

نحن معاشر الانبیاء لا نورث (ہم فرقہ انبیاء سے تعلق رکھتے ہیں ہمارا

کوئی وارث نہیں) اور حضرت صدیق نے آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے یہ حدیث سنی ہوگی۔ اس لئے ان کے حق میں یہ نص قطعی ہے۔ اور ایسے کاموں میں درگزر کرنا ٹھیک نہیں۔ اس جواب سے حضرت فاطمہؓ کی تسلی اس وجہ سے نہیں ہوئی ہوگی کہ ورثہ کا یہ ثبوت آیت توریت سے ثابت ہے۔ اس وقت تک اس حدیث نے شہرت نہ پائی ہوگی جو حضرت فاطمہ پر حجّت بن جاتی یا (یہ ناراضگی) نازک مزاجی کی وجہ سے ہو جو صاحبزادگی کی وجہ سے لازم ہے۔ لا تبدیل لخلق اللّٰہ (اللّٰہ کی مخلوق کے لئے کوئی تبدیلی نہیں ہے) کے مطابق کوئی کمال مزاج کی کسی خصوصیت کو نہیں بدل سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شدید غصہ دم واپسیں تک زائل نہ ہوا۔ اور وہ قصہ مشہور ہے کہ آپ نے ملک الموت کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ اس لئے ایسی صورت میں دونوں معذور ہیں اور دونوں طرف حق ثابت ہوتا ہے اور اہل سنت کے لئے دونوں کے لئے حسن ظن رکھنا اور دونوں کو اچھا سمجھنا واجب ہے۔ والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ (نیک راستے پر چلنے والوں پر سلامتی ہو۔) والسّلام۔

آپ نے جو کچھ اس زمانے کے ان ضعیف اعتقاد رکھنے والے کے بارے میں لکھا ہے جو درویشوں سے کشف و کرامت کے طالب ہوتے ہیں اور قرن اول سے ذہنی تعلق نہیں رکھتے، معلوم ہوا۔ جاننا چاہیئے کہ دوسرے مشائخ کی طرح ان کمینوں کو مرید کرنا کیا ضروری ہے۔ اور مخلص عقلمند جب ان امور مذکورہ کے لئے التماس کریں تو ان کی تسلی ان مطالب سے کرنی چاہئیے کہ خدا حکیم حقیقی ہے۔ اس آیت کریمہ کے مطابق اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (کہدو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا، اللہ نے اپنی محبت اور رضا کی بنیاد جو کہ تمام طریقوں کے صوفیوں کا مقصود اصلی ہے ہمارے پیغمبر علیہ السلام والصلوٰۃ کے اتباع پر رکھی ہے۔ خدا نے اس طبیب حاذق کو بعض اوامر منہیات کے ساتھ جو بمنزلہ دوا اور پرہیز کے ہیں اس دنیا میں امت مرحومہ کی اصلاح کے لئے بھیجا۔ جو غفلت اور معصیت میں مبتلا تھی اس نسخہ کے دو پہلو ہیں ایک صورت اور دوسرے معنویت۔ صورت ظاہر عوام مسلمین کے لئے ہے تاکہ اعتقادات کی تصحیح کے بعد کتاب وسنت

کے مطابق اپنے اعتقادات کو درست کر لیا جائے ۔ اور امر و نہی کے امتثال صرف میں اپنے اعضا کو استعمال کیا جائے ۔ ان عقائد و اعمال کی جز اتنعیمات جس ہے۔ نجات نسبا اسی میں ہے ۔ اس نسخہ کی "حقیقت" تو خواص کا حصّہ ہے اور وہ ہے صورتِ مذکورہ کے مطابق مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ قلب کی جلا اور نفس کا تزکیہ کرنا ۔ جس کا حاصل تجلیات اور مکاشفات کا ظہور ہے ۔ صورت عبارت ہے ایمان اور اسلام سے ، حقیقت عبارت ہے احسان سے ۔ جس کے بارے حدیث میں آیا ہے "تعبد ربك كانك تراه" (تو خدا کی عبادت اس طرح کر جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے) صورت بے حقیقت اس دور کی طرح ہے جو ظاہری جلد کے امراض کے لئے ہو مثلاً ورم یا زخم جو مالش اور لیپ کرنے سے ٹھیک ہو جاتے ہیں اور جو بے فائدہ نہیں ہیں لیکن حقیقت کا بغیر رعایت صورت کے ہونا غیر مفید ہے بلکہ وہ حقیقت ہی نہیں استدراج اور مکر الٰہی ہے۔ اعاذ نا اللہ منہا (ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں) اور حقیقت تنقیہ کی طرح ہے کہ جس پر موادِ فاسدہ کا نکلنا موقوف ہوتا ہے تاکہ نکسِ مرض کا احتمال نہ رہے۔ اس مرض سے مکمل شفا اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک ان دونوں کو نہ ملا لیا جائے ۔ اس بیان سے یہ بات معلوم کرنی چاہیئے کہ آنحضرت صلعم کے علاج سے صحابۂ کرام رض کی طبیعتوں پر شفاد صحت کے کیا آثار ظاہر ہوئے مخفی نہیں ہے (رسول کی صحبت سے) کہ خدا کی محبت کے غلبے اور خود کو اس کے اتباع اور رضا جوئی میں خرچ کرنے اور طاعت میں لذت محسوس کرنے اور گناہوں سے بالطبع کرنے اور دنیا سے کنارہ کشی کے علاوہ اور کچھ ظاہر نہیں ہوا ۔ ان آثار کے ظاہر ہونے سے دائمی حضوری قلب اور پاکی نفس ظاہر ہوئی جو آنحضرت صلعم کی صحبت کی برکت سے اور شریعت کے صحیح استعمال سے ظاہر ہوئی تھی ۔ اور قرونِ متاخرہ کے ذوق اور شوق کے متعلق

کچھ نہیں کیا۔ صورت و حقیقت کو مکمل طریقے پر حاصل کرنے کے باوجود کہ جس سے زیادہ حاصل کرنے کا تصور ممکن ہی نہیں۔ اکثر اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ اس صورت کو محفوظ رکھا جائے جو حقیقت کی محافظ ہے۔ اور جس کا فائدہ خواص و عوام دونوں کو پہنچتا ہے۔

ان لوگوں نے کشف و کرامت کی طرف کوئی التفات نہیں کیا۔ اور ان امور کو کمال کی شرط اور اس کے لئے لازم نہیں سمجھا۔ اس لئے جو مریض مکمل صحت یعنی نسبت محمدی چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اتباع سنت کو تمام مجاہدات اور ریاضات سے بہتر سمجھے اور جو انوار و برکات اس سے ظاہر ہوں انھیں تمام فیوضات سے بہتر و افضل جانے۔ تمام مشہور قسم کے اذواق و مواجید کی جمعیت باطن اور دوام حضور کے مقابلے میں کوئی اختیار نہیں۔ اور جس عزیز کی صحبت میں ان امور کا اثر پائے اسے نائب رسول خدا سمجھے۔ اس کی خدمت کو لازم جانے۔ اس راستے کے جوز و مویز (پھل) پر فریفتہ نہ ہو۔ خواہ وہ لذیذ ہی کیوں نہ ہوں والسّلام۔

بنام شاہ ابوالفتح

(۲۲)

مدت کے بعد مخدوم زادہ گرامی کا التفات نامہ موصول ہوا۔ جس نے جان تازہ بخش دی۔ اور نسبت اخلاص کی تجدید و تقویت کا سبب ہوا۔ آپ نے سلوک کے آغاز و انجام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے میں نے مطالعہ کیا۔ وہ اطوار و آثار جو آپ میں ظاہر ہو رہے ہیں ان سے بہت سی امیدیں ہیں۔ خاص کر ان حاصل شدہ امور کو جاننا جو اکثر لوگوں کے غرور کا سبب بنتے ہیں۔ خدا کی طلب ہم جیسے نامراد فقیروں سے مراد چاہنا اور بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلانا وحدت وجود کے سمندر کے طوفان سے کنارے پر آنا۔ ہمارے طریقہ کے بزرگوں سے (جن کی ریاضتیں اتباع سنت ہیں اور جو شریعت کے حقائق کے اسرار کو جاننے والے ہیں) نسبت کی آرزو رکھنا طہارت طلب اور علو ہمت کی دلیل ہے۔ بارک اللہ فی برکاتکم واعلی درجاتکم۔ (اللہ اور بھی برکت دے اور آپ کے درجے بڑھائے۔)

مخدوما! آپ نے حضرت والد ماجد اور حضرت میاں ہمت خاں صاحب کے افادات کے ثمرات یعنی واردات غریبہ و احوالات عجیبہ و استیلاء غیب اور ظہور کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے یہ سب لطیفہ نز

قلب کے آثار ہیں۔ اور یہ مقام تمکین ہے۔ اس لطیفہ کی انتہا ہے کہ یہ تنگنائے امکان سے باہر آجاتا ہے اور مقدمۂ وجوب کی وسعت میں آکر دائرۂ ظلال اسمأ و صفات کی سیر کرتا ہے جو تعینات عالم کے مبادی ہیں اور ظل خاص میں جو تعین امر کا مبدا ہے فانی ہو جاتا ہے اور اسی ظل سے بقأ حاصل ہوتی ہے۔ اس قوم کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے فنائے قلب اور ولایت صغرا جو اولیاء کی ولایت ہے۔ اور ولایت ظلی سے جو محل سکر ہے وحدت وجود کے معارف پیدا ہوتے ہیں۔ قلب کے ضمن میں اس مقام پر نفس کو فنا کی ہم رنگی حاصل ہوتی ہے۔ اس ولایت کے حصول کا اثر خدا کی ایسی دائمی حضوری ہے جس میں کبھی غفلت نہیں آتی۔ کسی اور سے تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس مقام سے اوپر ایک اور مقام ہے جس میں سالک کی سیر اس ظلال کے اصول میں ہوتی ہے جس کا نام اسمأ و صفات ہے۔ اور معاملہ لطیفۂ نفس پر آپڑتا ہے جو عالم خلق سے ہے، جیسا کہ پچھلے مقام ہیں قلب اور چاروں لطائف سے کام آپڑا تھا جو عالم امر میں ہیں اور جن کا ظہور مرکز ظلال تک ہے یہاں نفس کو حقیقت فنا مل جاتی ہے۔ اور نفس امارہ نفس مطمئنہ میں بدل جاتا ہے اور مخالف دشمن موافق دوست بن جاتا ہے۔ اور دعوت و ارشاد کا حق مل جاتا ہے کیوں کہ یہ مقام بعد الجمع کی چوٹی ہے۔ اس لئے یہاں پر تمیز صحیح حاصل کر کے وحدت شہودی کا راز (جو خلق سے غیرت حق کی خبر دیتا ہے) معلوم ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ان چیزوں کی طرف راغب ہوتا ہے جنہیں خدا پسند کرتا ہے اور ان سے گریز کرتا ہے جن سے خدا کو نفرت ہے۔

ریاضت اس حد تک کرتا ہے کہ کلفت درمیان سے جاتی رہتی ہے۔ اس مقام کو تعبیر کیا جاتا ہے فنائے نفس سے اور ولایت کبریٰ سے جو انبیاء کی ولایت

ہے اور آنحضرتؐ کی پیروی کی برکت سے امّت کے خاص لوگوں کو یہ مقام حاصل ہے ۔ یہاں پر سالک کو اسماء و صفات کے کمالات کی سیر ہوتی ہے جو اسم ہو الظاہر سے متعلق ہیں ۔ اس ولایت سے اوپر ملائکہ کی ولایت ہے جسے ولایت علیا کہتے ہیں ۔ یہاں ہو الباطن سے متعلق کمالات کی سیر ہوتی ہے ۔ اس ولایت کے حاصل کرنے سے یہ فائدہ ہے کہ تجلی ذات کی قابلیت ہو جاتی ہے ۔ اسس مقام سے بڑھ کر نبوت اور رسالت کے کمالات ہیں ۔ اس مقام پر حضرت ذات سے اسماء و صفات کے عدم جواز کے باوجود تجلی مجرّد ذات عارف پر ظاہر ہو جاتی ہے ۔ اور یہاں پر چاروں عنصروں سے جو لطیفۂ نفس کا اصول ہیں واسطہ پڑتا ہے ۔ یعنی ولایت علیا میں خاک کے علاوہ باقی تین عناصر سے اور کمالات نبوت میں صرف خاک سے ، چونکہ ذاتِ عالیہ کے اعتبارات و شیونات بہت زیادہ ہیں ان کمالات سے بالاتر بھی مقامات ثابت ہیں اور خود اپنے مقام پر مذکور ہیں ۔ اس راستے میں سب سے مشکل کام فنائے قلب اور فنائے نفس حاصل کرنا ہے اور دوسرے مراتب ان دونوں فنا پر مبنی ہیں ۔ اور جن مقامات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ہر مقام پر عروج و نزول ، فنا اور بقا دونوں ہیں ۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حضرت مجددؒ کی تحقیق کے مطابق اور اکابر متقدمین کے مناسب مذاق ہے لیکن دوسرے مشائخ اس سلسلے میں احتمال رکھتے ہیں جو سالکوں کے شوق کا سبب ہوتے ہیں ۔ اس طرح جذبہ کو سلوک پر تقدم حاصل ہے ۔ ہر چند شیخ کے نفس مفید کی تاثیر کو مرید کے باطن میں پورا دخل حاصل ہے لیکن استعداد مفید ہونا شرط ہے ۔ آپ سے ملاقات کی بہت آرزو ہے ۔ خدا ہمارے اور آپ کے ساتھ انصاف کرے ۔ والسّلام ۔

(۲۳)

برخوردار تمہارے التماس کے مطابق وحدتِ وجود کا مسئلہ لکھا جاتا ہے۔ جاننا چاہیے مراتب ستہ کی شرح میں لکھا ہے کہ خدا اپنے علم قدیم میں حقائق کلیہ و جزیہ جانتا ہے۔ کسی شئے کے علم سے اس شئے کا وجود علم میں لازم آتا ہے اس لئے چاہیئے کہ تمام موجودہ چیزیں علم ازلی میں موجود ہوں۔ اسی وجہ سے صوفیا، "ہر چیز کا وجود علم میں ثابت ہے" کے قائل ہیں۔ اس مرتبہ علم میں جس کا نام اس قوم (صوفیہ) کی اصطلاح میں باطنِ وجود ہے۔ وجودات اشیاء کو زمانے کے اعتبار سے تقدیم و تاخیر حاصل ہے۔ اس کے برخلاف وجود خارجی میں تقدیم و تاخیر بدیہی ہے کیوں کہ وجود علمی و وجود خارجی سے الگ چیز ہے اور چاہیئے کہ اس سے مقدم رہے۔ جیسا کہ اصل کو فرع پر اور ظل والی چیز کو ظل پر تقدم حاصل ہوتا ہے وجود علمی سے خارجی اشیاء کے وجود میں آنے کی کیفیت یہ ہے کہ جب خدا چاہتا ہے کہ کسی ایسی صورت کو صور علمیہ سے وجود میں لائے جسے وجود منبسط کہتے ہیں اور جسے اس قوم کی اصطلاح میں ظاہر وجود کہتے ہیں اور اس صورت کے آثار مطلوبہ کو اس صورت سے ظاہر کرے تو اس صورت اور اس وجود کے نور کے درمیان ایسا رشتہ پیدا کر دیتا ہے جو ذہن میں تو معلوم ہوتا ہے لیکن از

روئے کیفیت نہیں معلوم ہوتا۔ اور وجود منبسط کا آئینہ اس صورت کے عکس سے منقش کرتا ہے اور اس طرح کرتا ہے کہ نقش اطلاقِ وجود برہم نہ ہو و لِلّٰہ مثل الاعلیٰ (اللہ کے لئے بڑی مثال ہے)، جیساکہ دیکھنے والا کا عکس آئینہ کے سامنے آکر آئینہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سے آئینہ کا نور زائل نہیں ہوجاتا۔ عقل سلیم رکھنے والا تھوڑے سے غور کے بعد یہ نہیں کہہ سکتا کہ صورت مرئیہ آئینہ میں یا آئینہ پر ہے۔ کیوں کہ وہاں دخول ہے نہ ارتسام اگرچہ بظاہر اور عوام کی سمجھ کے مطابق صورت مرئیہ اور وصف مرئیہ ایک ظرف میں ہے جو مرآت ہوتا ہے اور حقیقت کے مطابق صورت و مرآت آئینہ میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ یعنی شکل و لون صورت مرآت سے پیدا ہوتی ہے اور تقعر و تحدب آئینہ صورت سے ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا جامی "مراتب ستہ" میں فرماتے ہیں کہ اگر وجود کو مرآت سمجھیں تو اس میں بظاہر صورِ علمیہ کے آثار و احکام پائے جاتے ہیں۔ لان الاعیان الثابتۃ فی العلم ما شمت رائحۃ الوجود فی الخارج (چیزیں علم میں ثابت ہیں اور میں نے خارج میں وجود کی بو نہیں سونگھی) اور اگر صورِ علمیہ کو مرآت قرار دیں تو اس میں اسماء، وصفات کی تجلیات اور حضرت وجود کے شیونات ہیں نہ کہ وجود بعینہ۔ چنانچہ شان مرآت خزانہ علم کی طرح ہے جو منقوش صفحے کی طرح ہے اور وجود منبسط صیقل کئے ہوئے آئینہ کی جگہ اس کے مقابلے میں ہے۔ اس صفحہ میں سے نہ کوئی نقش باہر آتا ہے اور نہ کوئی صورت مرآت وجود میں آتی ہے کیونکہ مرتبۂ علم میں سے صورت علمیہ کا خروج مستلزم جہل ہے۔ اور مرآت وجود میں دخولِ صورت سے قیام حادث قدیم ہوتا ہے اور یہ دونوں مشکل ہیں۔ اس لئے باطن وجود اور ظاہر وجود کے درمیان

طرفین کے آثار واحکام کے عکس سے ایک طلسم ہے۔ جو اس قوم کی اصطلاح میں مرتبۂ وہم اور دائرۂ امکان کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں پانچ مشہور منزلات میں سے تین منزلات امکانیہ پائے جاتے ہیں۔ یعنی تنزل روحی، مثالی اور جسدی۔ چنانچہ مرتبہ علم واجبی ہیں دو تنزل وجوبی ہیں یعنی وحدت و واحدیت جو عبارت ہیں مرتبۂ علم میں خدا کے شیونات صفات کو اجمالاً اور تفصیلاً ملاحظہ کرنے سے اور کہتے ہیں کہ خارج میں وجود واحد کے علاوہ کسی شئے کی تحقیق اور اس کا ثبوت نہیں اور کثرت مرئیہ مرتبۂ وہم میں ہے۔ حکمت بالغہ نے اس وہم کو تقویت دی ہے۔ اور اس پر آثار ابدی کی بنیاد رکھی ہے۔ نہ کہ اس وہم پر جو رفع وہم کے بعد اٹھ جاتا ہے۔ اس مرتبہ پر اطلاق وہم سے اس قوم کی مراد یہ ہے کہ اس کثرت کی کوئی دوسری حقیقت نہیں۔ تمام وجود واحد اس مرائت وجود منبسط میں تجلیات بن گیا ہے اور اس کثرت سے تجلیات شیونات سے پیدا ہوئے ہیں جو حضرت وجود میں موجود ہیں اور مرتبہ علم میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے بیج سے کوئی پودا اگتا ہے۔ اس طرح حقائق ممکنات بن جاتے ہیں اور ان حقائق کا عکس مرأت وجود منبسط ہو کر عالم کہلایا۔ اور چونکہ وہمی اشیاء کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ وہ وجود علمی کا عکس ہے اور نفس الامر میں تمام وجود علمی کے ساتھ موجود ہے۔ مرتبہ علم سے نہیں نکلی ہیں۔ جیسا کہ ذکر کر دیا گیا ہے۔ اور علم حقیقی خدا کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ وجودیہ صوفیوں کے خیال میں صفات عین ذات ہے۔ اس لئے اس تقریر کے بموجب اشیاء کا وجود عین وجود حق ہے۔ حضرت مجدد نے فرمایا ہے (ان شئت قلت حق وان شئت قلت خلق) جس چیز کو میں نے چاہا حق کہہ دیا اور جس چیز کو چاہا خلق کہہ دیا) اور ثابت ہو گیا کہ خارج میں وجود واحد کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وحدت وجود کے معنی ہیں۔ اور یہی ان حضرات کا مکشوف اور مشہود ہے۔

بنام میر مُسلمان

قاصد کو جلدی ہے۔ استخارہ میسر نہ ہوا۔ استخارہ مسنونہ کرلینا چاہیے
انشاء اللہ تعالیٰ پہلے ہی خبر مل جائے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ تمام توکل و تامل
متعلقان کے مرض دائمی، اور ویران شہر و فساد زماں کے ساتھ بڑے اطمینان
سے بسر ہوتی ہے۔ نحمدہ و نستعینہ (اللہ کی تعریف کرتے ہیں اور اس سے
مدد مانگتے ہیں)

خدا عزیزوں کو توفیق اتباع سنت دے اور اپنے ذکر میں مشغول رکھے
شیخ احمد[۲] پابندی سے کام کر رہا ہے۔ اس کا لطیفۂ قلب قید قالب سے
باہر آگیا ہے۔ لیکن اس کی استعداد بہت کم ہے۔ بہرحال گرتا پڑتا راہ
مقصود پر جاتا ہے۔ خدا منزل معہود پر پہنچا دے۔ چونکہ امراض قلب و
قالب کا سلب کرنا ہمارے حضرات رضی تعالیٰ عنہم کا معمول تھا اور خدا
نے آپ کو یہ قوت اور قدرت عطا کی ہے تو پھر آپ کیوں انکساری کی وجہ
سے خود کو اس امر خیر میں معذور سمجھتے ہیں۔ فیض اللہ خاں صاحب کو ہر
روز سامنے بٹھا کر پانچ سو دفعہ ان کے مرض کا نفس سلب کرائیں۔ تاکید
ہے۔ شاہ سیف اللہ صاحب کی رفاقت میں سفر حجاز کا قصد مبارک ہو۔

لیکن مردم محل کی مرضی شرط ہے کیوں کہ ان کا آپ پر شرعی حق ہے۔آپ کی عدم موجودگی میں کوئی معتبر خادم نظر نہیں آتا۔ اپنے ساتھ زیادہ سامان لے جانا مقصد کے منافی ہے۔اس نیک خجستہ نیت پر عمل کرنے کے لئے تھوڑا بہت غور کرنا چاہئیے، ایسا نہ ہو کہ پس پردہ کوئی برائی ہو۔عزیزوں دوستوں اور ہم مشربوں کی طرف سے سلام قبول فرمائیں۔

والسّلام۔

بنام میر مسلمان

(۲۵)

آپ کا التفات نامہ موصول ہوا۔جس میں آپ نے شیخ احمد کے غائب ہونے کی پریشانی کا ذکر کیا ہے۔ دل کو پریشانی ہوئی۔اس کے یہاں پہنچنے پر محبت کے حقوق کی وجہ سے اور آپ کے دیئے ہوئے احکام کی تابعداری کی رعایت سے اس پر شفقت اور مہربانی کی جائے گی۔ اور اگر وہ کسی دوسری طرف چلا گیا تو بہ شرط تاثیر انشاءاللہ تعالیٰ جلد توجہ کی جائے گی اور محفوظ و مصئون منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ آپ خاطر جمع رکھیئے۔عزیزو دوستوں اور یارانِ طریقہ کو سلام پہنچا دیجیئے۔ خدا کرے فرخ آباد کی آب و ہوا آپ کے مزاجِ عالی کو سازگار آجائے۔خوف یہ ہے کہ وہاں طریقۂ مجددیہ سے بیگانے بہت لوگ ہیں۔ اور اپنے عزیزوں کی تعداد بہت کم ہے خدا ان کی صحبت راس لائے۔ شیخ احمد جو مستقبل میں یہاں پہنچے گا اس کا یہاں دو مہینے رہنے کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ بقدر صحبت اور فرصت طریقہ حاصل کرے گا۔ فقیر دکن میں رہنے والے صاحبوں کے خطوط کا جواب نہیں دیتا کیوں کہ ہزاروں سال بعد ایک دوسرے کو خط پہنچتا ہے۔ زندگی کی امید کہاں ہے کہ خط لکھنے کی تکلیف اٹھاؤں اور دوستوں کو یاد کروں (مجھے) یاد کرنے والے عزیزوں کو خدا سلامت رکھے اور اگر

آپ حیدر آباد تشریف لے جائیں تو فقیر کا اشتیاق اور زبانی سلام پہنچا دیجئے۔ آج کل یہاں کے حالات یہ ہیں کہ پچھلے دو مہینے سے ہر روز کوئی نہ کوئی مکروہ واقعہ پیش آتا ہے۔ خدا اسے دور کرے۔ خدا فتوحاتِ ظاہری و باطنی عنایت کرے۔ خدا کی رحمت سے متوقع رہیے۔

والسّلام۔

بنام میر مسلمان

(۲۶)

فقیر ۱۹ جمادی الآخر بروز شنبہ دہلی کے لئے روانہ ہو گیا ہے، خدا پہنچا دے۔ آپ کی جدائی کا داغ اپنے ہمراہ لئے جاتا ہوں۔ خدا قادر ہے کہ ہم دونوں کے ضعف پیری کے باوجود سعادت ملاقات سراپا برکات میسر ہو۔ مختصر عنایت نامہ اور ظرفِ مسیّ موصول ہوئے۔ بارک اللہ فی رزقکم و عمرکم (اللہ آپ کے رزق اور عمر میں برکت دے) اور خاتمہ بالخیر کے لئے اور مکروہات سے حفظ وامان اور ظاہری و باطنی فتوحات کے لئے آپ کے واسطے اور جان سے زیادہ عزیز خاں کے لئے (جن کے خط سے مرض کی کیفیت معلوم ہوئی اور اس خبر سے بہت تشویش ہوئی) ہر وقت دعا کرتا ہوں خدا قبول کرے۔ فیض اللہ خاں[۱] صاحب کے مناقب و محاسن کے بارے میں کیا لکھوں کہ اس نوجوان کے نسخہ وجود میں تمام عالم کی خوبیاں جمع ہو گئی ہیں خدا اس کو دین و دنیا کے اعلیٰ ترین مراتب پر پہنچائے۔ فقیر کا سلام اور بہت اور بہت زیادہ اشتیاق کہہ دیجئے۔ ان کی اولاد اور رفیقوں کو بھی دعا کہہ دیجئے۔ نواب ارشاد[۲] خاں مغفور نے اواخرِ صفر میں یہاں سے سفر کیا مراد آباد کی حدود میں بادشاہ کو پالیا اور لشکر کے ہمراہ دہلی کا قصد کیا۔ ۱۳ ربیع الآخر کو شہر میں داخل ہوئے۔ دو گھڑی توقف کے بعد ٹھنڈا پانی پیا سردی

لگی اور انتقال فرما گئے۔ دل پر ایسا داغ چھوڑ گئے کہ جس کا مرہم نہیں۔ ان کے بیٹے اور بھائی وطن کو واپس گئے۔ ظفر علی خاں حضور میں رہے۔ سرداران بسولی نے ان کے ساتھ تعلقات بحال رکھے۔ ایسے ماتم کے وقت اور یہاں کے لوگوں کی معاش کی فکر میں اپنا وعدہ وفا کرنے یعنی تمہیں اشعار انتخابی بھیجنے کی فرصت کہاں ہے اور دوسرے یہ کہ اس شہر کے لوگوں کے لئے سید جیون صاحب کا تشریف لانا نعمت ہے۔ وہ طبقۂ عالیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں سلام نیاز پہنچا دیں۔ اور شیخ احمد دعا کریں۔ اور خدا کی عبادت میں مشغول رہیں۔ میر مبین نے کچھ عرصہ محنت کرکے اپنے کمالات کو کمالات نبوی تک پہنچا لیا ہے اور نسبت ارشاد کی حاصل کر لی ہے۔ کل انھیں اجازتِ ارشاد اور خرقہ بھی دے دیا گیا۔ اللہ برکت دے۔

والسلام

بنام میر مسلمان

(۲۷)

حمد و صلوٰۃ کے بعد! حضرت میر صاحب مشفقِ من ہزاروں سال سلامت رہیں ۔میں مر چکا تھا اور وصال سے ناامید ہو چکا تھا ۔اس علاقہ میں آپ کی تشریف آوری کی خبر نے آب حیات بن کر اس سو سالہ بوڑھے کو زندہ جاوید کر دیا ۔کیا کروں بڑھاپے کی کمزوری اور کثرتِ تعلیم طریقہ سے کہ روز سو بلکہ زیادہ لوگوں کو توجہ دینے کا اتفاق ہوتا ہے ۔قوت اس قدر زائل ہو چکی ہے کہ نماز فرض میں صرف طاقتِ قیام باقی رہ گئی ہے ورنہ زندگی بخشنے والی اس خبر کو سنتے ہی سر کے بل دوڑا ہوا آتا ۔انشاءاللہ تعالیٰ ماہ صفر میں سنبھل آنے کا ارادہ ہے کیونکہ پچھلے کچھ برسوں سے ہر برس وہاں آنے کا اتفاق ہوتا ہے ۔اس علاقے میں اپنے پہنچنے کی اطلاع دے دوں گا ۔یقین ہے کہ اس مردہ کو زندہ کرنے پر آپ توجہ کریں گے ۔

پچھلے زمانوں کو یاد کر کے جو دل پر گزرتی ہے اور جس طرح اپنی تنہائی پر مجھے رحم آتا ہے وہ قالب تحریر میں نہیں آسکتا نفحات الانس کے نسخۂ مبارک میں استاد ابوالقاسم قشیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذکر میں یہ دو شعر نظر پڑے جس نے مجھ میں وجد کی کیفیت پیدا کر دی ۔شعر یہ ہیں

سقی اللہ وقتا کنت اخلو بوجھکم   وثغر الھوی فی روضۃ الانس ضاحک

اقمنا زمانا والعیون قریرۃ　　　　وصبحت یوما والجفون؟

(اللہ نے مجھے اس وقت پلایا جب میں تمہارے چہرے کو دیکھنے میں مشغول تھا محبت کے باغ میں خواہش کے درخت مسکرا رہے تھے۔ ہم کچھ دیر ٹھہرے رہے اس حال میں کہ آنکھیں ٹھنڈی تھیں اور میں نے صبح کی اس حال میں کہ آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں)، امید یہ ہے کہ خط و کتابت میں آپ پرانے طریقہ یعنی لفظ مرزا صاحب پر اکتفا کریں گے۔ اور اپنے احوالِ برکات اشتمال اور نیک ارادوں سے مطلع کریں گے۔ والسّلام۔

بنام مولوی ثناءاللہ سنبھلی[1]

(۲۸)

اللہ معکم اینما کنتم (تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے)
تم اس جگہ جا کر فقیر کی جگہ کو گرم کرو۔ کیونکہ اس ضلع میں کوئی سمجھ دار عالم اور صاحب نسبت درویش نہیں ہے۔ خاطر جمعی سے اپنے کام میں کوشاں اور سرگرم رہنا چاہیئے۔ اور تشویش کو اپنے باطن میں راہ نہیں دینا چاہیے۔ اور اپنا وقت دین کی ظاہری اور باطنی خوبیاں پھیلانے میں صرف کرو۔ خدا نے تم کو دولت دی ہے۔ اس کے شکر کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ قال الجنید: الشکر صرف النعمۃ فی مرضیات المنعم۔ (جنید نے کہا: انعام دینے والے کی مرضی کے مطابق انعام کو خرچ کرنا شکر ہے) کوئی عبادت اس عمل کے برابر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ اصلاح ہے اور نیابت نبوت ہے۔ پیغمبر پر درود اور سلامتی۔ ع "مشکلے نیست کہ آساں نہ شود"

اگر غیب سے کوئی چیز معین ہو جائے تو بے مضائقہ اسے قبول کر لینا چاہیئے کیونکہ بغیر مانگے جو آمدنی مقرر ہو وہ توکل کے منافی نہیں ہے۔ اگر اس پر بھروسہ نہ ہو اور خاص طور پر اس زمانے میں تو دل میں تفرقہ اٹھنے کا سبب ہوتا ہے اور توکل بے اطمینانی کی نذر ہو جاتا ہے۔ صوفیوں کا راس المال تو یہی جمعیت ہے۔ انشاءاللہ خدا سنت نبوی کی پیروی کرنے والوں اور

خانقاہ مجددیہ کے درویشوں کو بیکار نہیں چھوڑے گا۔ خاطر جمع رکھیے۔ تعلیم طریقہ اور درس کتب میں پابندی سے مشغول رہیے۔ ہمارے طریقہ کے بزرگوں اور حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ختم پر ہر روز حلقہ کے بعد لازمی طور پر پڑھیئے خدا سے امیدوار اور اس کے علاوہ ہر ایک سے ناامید ہو جایئے۔ کفار مرہٹوں کے ہنگاموں سے مت ڈریئے۔ انشاء اللہ دوستوں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ ان مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے جتنی دفعہ سورۃ لِاِیلٰفِ پڑھ سکتے ہوں پڑھیے اور کفار کے لشکر پر اسلام کی فتح کے لئے دعا اور صرف ہمت واجب ہے۔ غافل نہ رہنا۔ اگرچہ اس قوم کے مسلمانوں کا حال معلوم ہے۔ لیکن اسلام کا حق تمام امور میں مقدم ہے اور ملازمت سے سلام کے بعد کہنا کہ دنیا فانی ہے اور آخرت ہمیشہ رہے گی۔ اتنا انصاف ضروری ہے کہ اپنے اوقات کا دسواں حصہ آخرت کے شغل میں خرچ کریں اور اگر توفیق ہو تو خاص اوقات میں نواب ارشاد خاں بہادر کی بھلائی اور جمعیت اور ان کی صحت و عافیت کے لئے دعا کرنے کو واجب سمجھیں۔ اللّٰھم اجعل خیر عمری اٰخرہ (اے خدا میرے انجام کو بہتر بنائیں۔) والسلام۔

بنام مولوی ثناءاللہؒ سنبھلی(۲)

(۲۹)

محمد دانش بنگالی جو شاہ مراد اللہ کے دوستوں میں ہیں اور جو ڈیڑھ سال اس خانقاہ میں رہے ہیں۔ اپنی استعداد کے مطابق انھوں نے فیض و برکتِ طریقہ حاصل کر لئے۔ چند روز کی رخصت لی ہے۔ ظاہراً اسی طرف واپس آنے کا ارادہ ہے۔ آپ کی خدمت میں پہنچتے ہیں۔ ان پر مہربانی اور کرم کیجئے۔ ہر چند مردِ سادہ ہیں لیکن طالبِ خدا ہیں۔ جادۂ شریعت و طریقت پر خدا آپ کو اور استقامت دے ؎

والسلام۔

بنام مولوی ثناء اللہ سنبھلی[۳]

(۳۰)

جتنے یارانِ قدیم آئے تھے سب چلے گئے۔ میاں محمد منیر[۱] خاص طور پر کیونکہ وہ بہت سی باتوں میں اکثر یارانِ طریقت سے ممتاز تھے۔ وہ اس مہینے کی انیس تاریخ کو ذات الصدر کے مرض میں رحلت فرما گئے۔ فقیر کو سخت صدمہ پہنچا۔ چونکہ عمر طبعی کو پہنچنے کی وجہ سے ہمارے انتقال کا وقت بھی قریب ہے اس لئے تسلی ہو گئی۔ انھوں نے کوئی بیٹا چھوڑا نہ خلیفہ (اس لئے) ان کے مریدوں کی تربیت اور پس ماندگان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری فقیر کی گردن پر پڑی۔ تمہاری ذات سے جویندگانِ خدا کو فائدے پہنچ رہے ہیں انھیں جان کر خوشی ہوئی۔ بارک اللہ فی برکاتکم (اللہ تمہارے برکات میں اضافہ کرے)

جو کچھ آپ نے برخوردار ظفر علی خاں کے بارے میں لکھا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اخلاق، مناقب، اخلاص اور دوسری خوبیوں میں سے جو کچھ ہونی چاہیے ہیں اور جنھیں دل چاہتا ہے وہ سب اس میں ہیں۔ اس کی انھیں خوبیوں نے مجھے اپنا شکار کر رکھا ہے ورنہ مجھ جیسے آزاد انسان کو جسے خود اپنی فکر نہیں کسی دوسرے سے کیا مطلب۔ خدا اسے فتوحاتِ صوری و معنوی عطا کرے۔ کیوں کہ مجھے دنیا میں اس سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی ماں، باپ کی جگہ اور اس کی خبر گیری کرنے والے کی بجائے

سب کچھ میں ہی ہوں ۔ وہ میرے ساتھ ارادت، فرزندی و غلامی اور بندگی کے آداب بجا لاتا ہے ۔ لیکن اس میں ایک کسر ہے جو میں جانتا ہوں ۔ اس لئے برخوردار پر پہلے سے زیادہ التفات کی جو حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے تلافی ہو سکے ۔ اس سے کہیے کہ ہر صبح فقیر کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھا کرے ۔ آپ اسے خود توجہ نہ دیں ۔ اس برخوردار کی رقت کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا تھا اس سے دل کو بہت صدمہ پہنچا ۔ میاں غلام محمد[۲] نے اپنے باطن کی کھوٹ ظاہر کر دی ۔ استعداد کے مطابق ان کی اصلاح کر دی گئی ۔ کہتے تھے کہ انھوں نے اسی کام کے لئے سفر کیا ہے ۔ خدا کرے کہ سچ ہو ۔ فقیر ایک دفعہ شاہ ولی اللہ[۳] کی عیادت کو گیا تھا، ان کی صحت کے لئے خدا سے ہمت طلب کی اور دعا میں مصروف ہوا ۔ حافظ غلام رسول[۴] نے ملاقات کی ۔ بزرگ آدمی ہیں ۔ مولوی ظہور اللہ[۵] جیو، سلام قبول کریں ۔ والسلام

بنام مولوی ثناءاللہ سنبھلی(۴)

(۳۱)

مسجد کے مکمل ہونے کی خبر ملی۔ خدا اسلام کی بنیاد اور مضبوط کرے۔ اس زمانے میں دل کو ایک سخت صدمہ پہنچا ہے۔ پچھلے مہینے کفار سکھ تھانیسر کے قلعہ پر قابض ہوگئے۔ اور انھوں نے خوب قتل و غارت کیا۔ مولوی قلندر بخش(۱) جیو سلمہ ربہ مع بیوی اور بچوں کے لٹ لٹا کر اور جانیں بچا کر نکل آئے۔ عجیب کیفیت ہوئی "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" بالکل ہی بے سروسامانی کی وجہ سے (تھانیسر) کے نواح میں مقیم ہیں اور ہم تک نہیں پہنچے۔ اس مصیبت کے علاوہ شرم کی بات یہ ہے کہ خصوصیت کے باوجود ہم اُن کی کوئی مدد نہ کرسکے۔ کیونکہ بے استطاعت ہیں۔ خدا اس کی تلافی کرے۔ اس سال بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس طرف کا سفر موقوف کردیا ہے۔ ایک تو امراض و عوارض کے ساتھ بڑھاپے کی کمزوری، دوسرے آمدنی کم تیسرے گھر کی تنہائی۔ کیونکہ کوئی کنیز اور خدمت گزار نہیں رہی۔ دس کنیزیں گھر سے چلی گئیں۔ اور اصیلیں بھی غلہ کی ارزانی کی وجہ سے نوکری کی پرواہ نہیں کرتیں۔ اور ہماری بیوی کی نازک مزاجی کی تاب بھی نہیں لاتیں۔ اس سے آج کل غلام یحییٰ کے گھر سے پکا پکایا آجاتا ہے۔ جنس یہاں سے چلی جاتی ہے۔ اور یہی حال شاہ علی کا ہے۔ دو بیویوں اور تین لڑکوں کے باوجود گھر میں

ایک بھی نوکر نہیں ۔ اور اس کی ناتوانی مزید ہے ۔ الحمدللہ علیٰ نوالہ والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد وآلہ (شکر ہے اللہ کا اس کی نعمتوں کے لئے اور درود اس کے رسول محمدؐ پر اور اس کی اولاد پر) آپ نے برخوردار ظفر علی (اللہ اس کو مرادوں کو پہنچائے) کی قابلیت اور انسانیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے بالکل درست ہے ۔ ابھی تک لوگوں نے اس کی قدر نہیں جانی ۔ وہ ایسا انمول ہیرا ہے جس کی کوئی قیمت نہیں فقیر بے وجہ اس کا عاشق نہیں ہے ۔ اس کی خوبیوں کو میں جانتا ہوں انشاءاللہ تعالیٰ اسے کمالات اخروی اور فتوحات دنیوی میں نمایاں ترقی ہوگی ۔ ضعف بصر سے تحریر میں رونق نہیں رہی اور لکھنے کی بھی طاقت نہیں ۔ اس خط کے بعد احباب مجھے جواب دینے سے قاصر سمجھیں ۔ اعتذار کا یہ مضمون تمام دوستوں تک پہنچا دیجئے کہ مجھے قاصر سمجھیں ۔ رمضان المبارک بخوبی گزر گیا اور یاران طریقہ وطن واپس چلے گئے ۔ خدا آپ کا حافظ وناصر رہے ۔ اگر آپ شریعت و طریقت کے مطابق زندگی گزاریں گے تو خدا دونوں جہان میں عزت و آبرو دے گا ۔ حکومت کے کاموں میں تشفی نہ رہی ۔ خدا خیر کرے ۔ برخوردار حفیظ اللہ اور حافظ محمدی کا بلانا ٹھیک ہوا ۔ تسلی کرنا چاہیئے ۔ والسّلام ۔

بنام شاہ محمد سالم[1]

۳۲

ہم بخیریت ہیں۔ تم شریعت کے التزام اور طریقت کے اشغال میں مصروف رہو۔ لوگوں سے خاکساری اور بے نفسی سے ملو کیونکہ کمال نفس نیک نیتی میں ہے اور ہستی صرف خدا کے لئے مسلّم ہے۔ عالموں اور فقیروں کی صحبت کو لازمی سمجھو۔ دنیا کے مکروہات پر صبر کرو کیوں کہ مومنوں کے لئے دنیا قید خانہ ہے اور راحت کا وعدہ آخرت کے لئے ہے بشرطیکہ ایمان سلامت رہے۔ خدا کی عطا کی ہوئی کم و بیش نعمتوں پر شکر ادا کرو۔ بد خلقی سے پیروں کو بدنام نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی تمہارے طریقے کی طرف آئے تو اس سے خدمت نہیں لینی چاہیے بلکہ اس کی خدمت کرو۔ ہاں اگر وہ محبت کے غلبہ سے خود خدمت کرے تو دوسری بات ہے۔ جہاں کہیں بھی رہو خدا کو یاد رکھو اور پیرانِ طریقہ کی محبت میں ڈوبے رہو۔ میاں محمد انوار برے حالوں پھر تمہارے پاس آرہے ہیں۔ حتی المقدور ان کی خاطر مدارات سے دریغ نہ کرنا۔ جانتے ہو دنیا میں خدا کے طالب کم ہیں۔ اگر کوئی آئے تو اسے خدا کا نام سکھاؤ کیونکہ اس کا بہت اجر ہے۔

والسّلام۔

بنام مولوی نعیم اللہ بہرائچی[1]

(۳۲)

طریقۂ الہٰیہ میں لوگوں کے داخل ہونے کی خوشخبری سے دل کو سرور ہوا بارک اللہ فی کمالکم وتکمیلکم (خدا تمہارے کمال اور تکمیل میں برکت دے) انشاء اللہ تعالیٰ استفادہ کرنے والوں کی کثرت ہوگی۔ اور دونوں جہان میں نعمتوں کی ارزانی ہوگی۔ خاطر جمع رکھو۔ اتباع سنت کی نیت سے شادی کرنا مبارک ہے۔ برخوردار میاں قاسم[2] کے حق میں دعا اور توجہ کر رہا ہوں اور معلوم ہوا تم بھی دعا کرتے ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ اثر ظاہر ہوگا۔ اس برخوردار سے جو قصور ہوا تھا اس جرم میں اس کی غلطی نہیں تھی۔ ہم نے معاف کردیا ہے اور لکھ دیا ہے پھر کیوں دل میں تردد پیدا کرتا ہے۔ تم بھی خاطر جمع رکھو۔ اور اس کے حق میں دعا اور توجہ کرتے رہو۔ ضعف پیری دن بدن بڑھ رہا ہے اور مریدوں کی کثرت اور انھیں توجہ دینے کی قوت میں تائید غیبی بھی روزافزوں ہے۔ الحمد للہ علیٰ نوالہ والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد والہ (شکر ہے اللہ کا اس کی نعمتوں کے لئے اور درود اس کے رسول محمد اور اس کی اولاد پر) شاہ شفیع[3] علیہ الرحمۃ فتق کے درد میں انتقال فرماگئے۔ اور مقبرہ شاہ ولی اللہ صاحب میں مدفون ہوئے۔ شاہ رحمت اللہ[4] بھی دہلی آئے تھے۔ رخصت والے دن یہاں سے ایک منزل گئے تھے۔ اچانک گر پڑے اور انتقال فرماگئے۔ تجہیز و تکفین کے بعد میاں محمد منیر مرحوم کے پہلو میں آسودہ ہیں۔ وہاں کے یاران طریقہ کو سلام کہنا فقیر کو دعاء اور توجہ سے غافل نہ سمجھیں

یارانِ طریقہ کے حالات نام بنام لکھنا۔ تم نے بالکل ٹھیک کیا کہ اپنے وطن سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ اس میں عقلمندی ہے۔ حضرت خواجہ محمد[۵] پارسا قدس سرہٗ ایک رسالے میں فرماتے ہیں کہ طالب کو چاہیئے کہ خود کو چار طرح کے فساد سے محفوظ رکھے۔ ایک تو ان لوگوں کی صحبت سے گریز کرے جو محرم نہیں ہیں یعنی ان میں شریک نہ ہو کیونکہ غافل کی صحبت سخت نقصان دہ ہے صحبۃ الفساق داء ودوائها مفارقتهم (نا جنس کی صحبت مرض اور اس کا علاج مفارقت ہے) دوسرے مشتبہ روزی (سے گریز کرے) تیسرے زیادہ کھانے سے۔ چوتھے روزی کو غفلت کے ساتھ کھانے سے۔ سالک جو لقمہ بھی غفلت کے ساتھ کھاتا ہے وہ صرف [illegible] ہے۔ اور جو کوئی زیادہ کھاتا ہے اس کی عبادت میں فرق پڑتا ہے۔ اور مشتبہ روزی کا ہر لقمہ باطن کے نور کو ظلمت میں بدل دیتا ہے اور جو کوئی غافل سے صحبت رکھتا ہے اسی جیسا ہو جاتا ہے اور جو کوئی اس سبق میں تیرا شریک نہیں وہ تیرا محرم نہیں، چاہے وہ آدمی بالغ ہو۔ تکلیف اٹھانے کے علاوہ اور کوئی علاج نہیں (یعنی اس کی صحبت سے گریز کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں۔) اس لئے چاہیے کہ جو شخص یا چیز اس کے راستے میں حائل ہو اس سے دور رہے۔ اور فرماتے ہیں کہ شریعت میں مرد اس وقت بالغ ہوتا ہے جب منی شہوت کے طریقے پر اس میں سے زائل ہو۔ لیکن طریقت میں اس وقت بالغ ہوتا ہے جب وہ حلقۂ شہوت سے باہر آتا ہے۔ (یعنی شہوت پر قابو پا لیتا ہے) شریعت میں فقیر وہ ہوتا ہے کہ جس کے پاس کوئی چیز نہ ہو اور طریقت میں اسے فقیر کہتے ہیں کہ جس کے باطن یعنی دل کو سوائے خدا کو اور کسی کی خبر نہ ہو۔ یہ وہ فقر ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر کیا ہے اور فرمایا ہے "الفقر فخری"

والسلام۔

بنام میاں محمد قاسم

(۳۴)

جس دن سے نجف[1] خاں آیا ہے۔ اس شہر میں فقیر سے لے کر بادشاہ تک ہر شخص کی حالت خراب ہے۔ ہر خاص دعام کی زبان پر مجد الدولہ[2] کی رہائی کا ذکر ہے۔ خدا جلد ہی کچھ کردے گا۔ کل تمہارا خط ملا۔ بہت تشویش ہوئی۔ فقیر بھی دعا کرتا ہے۔ یارانِ حلقہ اور میاں محمد مراد جیسے لوگوں سے تمہارے حصولِ مقاصد کے لئے دعا کرائی ہے قوی امید ہے کہ دعا قبول ہوگی اور اس کا اثر ہوگا۔ خاطر جمع رکھو۔ فقیر تم سے غافل نہیں ہے۔ جب کبھی اپنے آقا کے سامنے جاؤ تو تین بار یا مقلب القلوب والابصار اور شروع و آخر میں ایک بار درود پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکو اور (دونوں ہاتھ) اپنے چہرے پر پھیر لو پھر سامنے جاؤ۔ سورۂ لایلاف بسم اللہ کے ساتھ ہر روز ایک سو دفعہ پڑھو۔ شروع اور آخر میں پانچ بار درود پڑھو تاکہ دشمن کے شر سے محفوظ رہو۔ پھر انشاءاللہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ چھوٹا سا چاقو ملا۔ جو بچوں کے کھیلنے کے لئے ہے۔ ایک بچے کو دیدیا۔ اس کے بعد کسی بھی سلسلے میں کوئی تحفہ بھیجنے کی فکر نہ کرنا کیونکہ آب و ہوا کی ناسازی سے تمہارے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہے۔ فقیر تو سب سے ناامید ہے لیکن تمہارے اعزّہ کو تم سے شکایت ہے۔ اتنے طویل اور دور دراز سفر کے بعد جو تحفے تم نے رشتہ داروں کو بھیجے ہیں تمام بدرنگ

اور بدقماش ہیں (تمہارا) پیسے دے کر بری چیز خریدنا بھی عجیب بات ہے۔ اور فقیروں کی ناراضگی تو اس ایک مٹھی مٹی کی طرح ہوتی ہے جو دریا میں ڈال دی جائے۔ اب مجھ پر کوئی اثر نہیں۔ تم نے جو اس خط میں حد سے زیادہ معذرت کی ہے اس نے میرے دل کا غبار دھو دیا۔ بے فکر رہو۔ رمضان المبارک آگیا۔ اس دفعہ یارانِ طریقہ اور حافظانِ قرآن بہت زیادہ آگئے ہیں۔ انشاءاللہ تعالیٰ یہ مبارک مہینہ جمعیت اور برکات کے ساتھ گزار کر عید کے بعد آؤں گا۔

والسلام۔

بنام میاں محمد قاسم

۳۵

تمہارے پریشانیوں سے بھرے ہوئے خطوط نے پریشان کر دیا۔ میرے بھائی مکرر لکھ چکا ہوں کہ فقیر تمہارے لئے دعائے خیر میں کبھی تقصیر نہیں کرتا۔ تاثیر وقت آنے پر ہو سکتی ہے۔ یہ تمام ضعف اور کمزوری جس کا تم ہر خط میں ذکر کرتے ہو مجھے پریشان کر دیتی ہے کیونکہ میں شدید خفقان کا مریض ہوں۔ دفع شر کے لئے سورۂ لایلاف سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ہے۔ سورۂ لایلاف اور دعائے حزب البحر پڑھو۔ مولوی نعیم اللہ صاحب اور فقیر دعا کرتے رہتے ہیں انہیں دعاؤں کی وجہ سے تم اب تک شر مردم سے محفوظ ہو۔ اس کے بعد بھی حفظ و اماں کی توقع رکھو۔ کیا ضروری ہے کہ تم ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں لکھو کہ فلاں نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا اور فلاں نے ایسا۔ نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے خط کا جواب نہیں دے سکتا۔ اب دوستوں کو لکھ دیا ہے کہ جواب کے منتظر نہ رہیں۔ کیوں کہ میں معذور اور مردہ ہوں۔ جمعہ کو جامع مسجد بھی جانے کی طاقت نہ رہی اور گھر بھی نہیں جاتا۔ اتنی قوت کہاں ہے کہ علم الہٰی کی طرف متوجہ ہوں اور معلوم کروں کہ فلاں کے حق میں کیا مناسب ہے۔ اگر آج کل تم یہاں ہوتے تو میرا حال دریافت نہ کرتے۔ کل یا پرسوں فقیر کی رحلت کی خبر سن لوگے۔ جو کچھ تمہارے دل میں آئے اس پر عمل کرو۔ لیکن جیسا

کہ حدیث میں ہے پہلے استخارہ کرلو ۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا ٹھیک ہی ہوگا۔ ضعف اور ناتوانی حد سے گزر چکی ہے اور بہت سے امراض نے گھیر لیا ہے۔ صرف نمازِ فرض کھڑے ہو کر پڑھتا ہوں ۔ اور دونوں وقت حلقہ میں سو مرید حاضر ہوتے ہیں ۔ حیران ہوں کہ توجہ کی طاقت کہاں سے آتی ہے ۔ چار دام کے برابر غذا باقی ہے بیت الخلا جانا حکم سفر رکھتا ہے ۔ اس سال طاقت بہت زائل ہو گئی۔ مجھے خود اپنے جسم سے یہ توقع نہ تھی مولوی نعیم اللہ بہرائچی صاحب سے کہہ دیجئے کہ ان کا طویل خط ملا۔ حالات سے آگاہی ہوتی ۔ یاران حلقہ کو سلام پہنچا دیجئے ۔ مجھ میں جواب دینے کی طاقت نہیں ہے ۔ خاتمہ بالخیر کی دعا کریں ۔ والسلام ۔

بنام میاں محمد قاسم

(۳۶)

باعث تحریر یہ ہے کہ برج لال نامی ایک نوجوان میرے بہترین دوستوں میں سے اور فقیر کا خیال ہے کہ فن مصاحبت اور متصدیگری کے حسنِ سلیقہ میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتا۔ شریف اور نیک معاش ہے۔ آج کل اپنے وطن اکبر آباد سے روزگار کی تلاش میں یہاں آیا ہوا ہے۔ ہم منتظر تھے کہ تم جلد آؤ اور اِس شخص کو جو آدمیت کی مکمل تصویر ہے اپنے آقا سے ملواؤ۔ اس سے سب کو فائدے ہیں۔ آقا کو ایک سمجھدار اور باوفا دوست ملجائے گا۔ تمہیں یہ فائدہ ہے کہ ایسا آدمی تمہارا زور بازو ہو جائے گا۔ اور فقیر کو یہ فائدہ ہوگا کہ ایسا مخلص دوست روزگار کی وجہ سے ہم سے دور نہ ہوگا۔ اور تمہیں چاہیے کہ پہنچنے سے پہلے اپنے آقا کو اس کا مشتاق کر دو اور مجھے اس کی اطلاع دو تاکہ خوشی ہو۔ تم کو معلوم ہو کہ ہم نے اس اہتمام سے تم سے کسی کا ذکر نہیں کیا اور ہم کو مبالغہ کی عادت نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ امورِ دینی اور دنیوی میں تمہاری خاطر جمع رکھے۔ گزشتہ زمانے کی خاص صحبتیں اکثر یاد آتی ہیں، خدا پھر میسّر کرے۔ فقیر کو خود سے غافل نہ سمجھنا۔ ہر روز اور ہر وقت دل تمہاری طرف متوجہ ہے۔ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی اپنی جان سے غافل نہیں ہوتا۔ اور تم مجھے جان کی طرح عزیز ہو۔ انشاءاللہ تعالیٰ محفوظ رہو گے

مردم محل (زوجہ مرزا صاحب) بخیریت ہیں۔ خدا ساتھ خیریت کے خاتمہ کرے۔
متھرا کے پیڑے جو گھٹیرے سے بھیجے تھے سر بہ مہر پہنچے۔ اُنہیں دلانے لکلے بہت
مزے کے تھے۔ خدا جزائے خیر دے اور دونوں سفید تھان کہ ایک "لٹ" اور
دوسرا "تننگ" ہے پہنچے، دونوں خوب ہیں۔ اب فقیر کم قیمت کا لباس استعمال
کرتا ہے۔ چونکہ تم نے بہت سماجت کی ہے۔ اس لیئے تمہاری خاطر سے پہنونگا۔
ورنہ عدم قبول کی صورت میں تمہیں تکلیف ہو گی۔ میری بیوی کو سیر اور نیم سیر
بھیجنے کے لئے جو لکھا ہے، اس کی ضرورت نہیں۔ تمہارے گھر میں سب خیریت
ہے۔ والسّلام۔

بنام محمد اسحاق خاں

۳۷

تمہاری مستورہ کے دل پر جو توجہ کا اثر ہوا تھا اور جو تم نے شروع میں لکھا تھا وہ معلوم ہوا ۔ اس کے بعد توجہ دینے کا اتفاق نہیں ہوا ۔کیونکہ فقیر میں نسیان بہت زیادہ ہے اور کوئی یاد نہیں دلاتا ۔بہر حال ہم نے اس عفیفہ کی خاک میں پاک تخم بو دیے ہیں ۔ وقت آنے پر سرسبز ہو جائیں گے ۔ اس برخوردار کو چاہیے کہ ظاہر میں شریعت کی پابندی اور باطن میں ذکر طریقہ میں مشغول رہے ۔کیونکہ دونوں جہان کی فلاح کا انحصار اسی کام پر ہے اور آپ کو چاہیے کہ ظاہر میں شریعت کی پابندی اور باطن میں ذکر طریقہ میں مشغول رہیں ۔کیونکہ دونوں جہاں کی فلاح کا انحصار اسی کام پر ہے اور یہ بھی چاہیے کہ ذکر قلبی کے پابند رہیں اور شریعت کا التزام کریں ۔مشائخ کی محبت اور شغل باطن کو واجب جانیں ۔ نا اہل لوگ اور نامناسب کاموں سے احتراز لازمی سمجھیں اور علماء اور اہل دین و اہل شرع کی خدمت کو غنیمت سمجھیں ۔ اور تم نے اپنی اہلیہ کے ساتھ شاہجہاں آباد آنے کے بارے میں جو لکھا ہے اگر امن ہو تو مبارک ہے ۔تمہارے پہنچنے پر فقیر انشاء اللہ تعالیٰ نماز کے بعد ایک دو گھڑی دن چڑھے تک حلقہ سے نپٹنے یا اس کے بعد تمہاری مستورہ کو توجہ دے گا ۔ انھیں چاہیے کہ ہر روز نماز کے بعد

اپنا چہرہ اس طرف کر کے اور فیض باطن کی منتظر اور متوقع ہو کر بیٹھیں۔ اس عفیفہ کی محبت نے جو ہمارے بیٹے کی طرح ہے ہمارے دل میں تاثیر پیدا کر دی ہے۔ وہ بہت استعداد رکھتی ہے۔ اور جب توجہ ہوگی تو ترقی معلوم ہو جائے گی۔ خدا جہاں کہیں رکھے خوش و خرم اور محفوظ رکھے۔ تمہاری محبت ہم پر ثابت ہے۔ مولوی غلام یحییٰ کی وفات کے داغ کا کوئی مرہم نہیں۔

والسلام۔

(۱۱۸۶ھ)

بنام صاحبزادہ مرید حسن

(۳۸)

فقیر نے خواب میں معلوم کیا کہ تمہاری والدہ باطن میں ناخوش ہیں۔ والدہ کی ناراضگی آخرت اور دنیا میں نقصان کا سبب ہے۔ یہ بات خود والدۂ مشفقہ سے دریافت کرو۔ اگر یہ حقیقت ہے تو اس کا کفارہ ادا کرو اور تلافی کرو خدا تمہارے کاموں میں خیر و برکت دے۔ دعا سے غافل نہیں ہوں۔ لیکن ملاقات ہونا قسمت پر موقوف ہے۔ اخیر عمر ہے۔ اگر زندگی میں میسّر نہیں ہوئی تو بشرط سلامتِ ایمان انشاءاللہ تعالیٰ بہشت میں خاطر خواہ ملاقاتیں ہوں گی۔ خاتمہ بالخیر کی دعا میں یاد رکھیں۔ بے سروسامانی کے باوجود موسم برسات میں مفقود النجر فرزند کی تلاش میں نکلنے سے سوائے تکلیف کے کوئی فائدہ نہیں۔ رحمتِ الٰہی کی امید میں منتظر رہنا چاہیے۔ اگر اس کی عمر باقی ہے تو جلد یا بدیر آجائے گا۔

والسّلام۔

بنام نواب عبداللہ خاں شاہجہاں پوری[1]

(۳۹)

خدا ہمارے صاحب کو دنیائے مکروہات سے محفوظ اور کونین کے مرغوبات سے محظوظ رکھے۔ آپ کے اخلاقِ کریمہ نے فقیر پر جادو کر دیا ہے۔

کردی نگہے سوئیم حیرانِ تو گردیدم
اے کاش نمیدیدی اے کاش نمیدیدم

(تو نے ایک نگاہ میری طرف کی اور میں تیرا حیران بن گیا۔ اے کاش تو مجھے نہ دیکھتا اور کاش میں تجھے نہ دیکھتا)

مشکل یہ ہے کہ ہم دونوں کے سفر کرنے میں بہت سے موانع ہیں۔ اُس طرف شغلِ ملک داری ہے اور اِس طرف کمزوری اور ناتوانی کا غلبہ۔ خدا ہم دو دلوں کی فریاد سن لے تاکہ ملاقات میسّر ہو۔ خط و کتابت آدھی ملاقات کے برابر ہوتی ہے۔ اگر یہ رسم جاری رہے تو غنیمت ہے خدا آپ کو طویل عمر اور زندگی کا عیش و آرام عطا کرے۔

والسّلام۔

بنام نواب فیض اللہ خاں

(۴۰)

جذبِ قسمت اور احباب کی کشش کی وجہ سے فقیر سنبھل پہنچا ہے۔ امروہہ اور مراد آباد بھی دیکھا تاکہ مستقل قیام کے لئے جگہ کا انتخاب کیا جائے [۱]۔ اور متعلقان کو بلانے کا خیال کیا۔ کیونکہ دہلی میں روز روز کی پریشانیوں سے تنگ آگیا ہوں۔ دہلی سے شاہجہاں پور دور ہے اس لئے یہاں آگیا۔ سنبھل، مراد آباد اور امروہہ تینوں شہر کے لوگوں نے سماجت کی کہ میں ان کے شہر میں ٹھہروں لیکن نواب ارشاد خاں کے حقوق اور کشش نے نہ چھوڑا کہ دوسری جگہ کا ارادہ کرتا۔ اس شہر میں طالبان طریقہ بھی بہت زیادہ ہیں اقامت کا ارادہ کرلیا تھا متعلقان کو بلانے کے لئے آدمی بھیجا۔ انھوں نے معقول عذر لکھے مجبوراً دہلی جانا پڑا۔

مے باقی ماہتاب باقی

مارا بہ تو صد حساب باقی

مصیبت دور ہونے کا وقت قریب ہے۔ دعائے حزب البحر آپ کے پاس ہوگی اجازت ہے کہ مشکلات سے نجات پانے کے لئے اسے پڑھیں۔ اور اس کے پڑھنے کا طریقہ میر مسلمان صاحب سے سند کرلیں۔ اگر وہاں یہ دعا نہ ہو تو تحریر کریں تاکہ اسے لکھ کر بھیج دوں اور پڑھنے کا طریقہ بھی ارسال کردوں۔ محمد قلی سلیم کا ایک شعر یاد آیا جو مناسب حال ہے۔ ؎

منصوبۂ وصال میسّر نہ شد دریغ　　شطرنج عشق بازیٔ ما غائبانہ

(۱) ۱۱۸۳ھ

بنام نواب ارشاد علی خاں سنبھلی

(۱۴۱)

الحمد للہ علی نوالہ و سبحانہ و تعالیٰ (اللہ کا شکر ہے اس کی نعمتوں پر وہ پاک و بزرگ ہے اس کی ذات) کہ اس نے تم کو مصیبت سے بچالیا۔ تم نے موجودہ بادشاہ سے جو توسل کیا ہے اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ان دنیا داروں کا مفصّل حال ہم کور باطنوں کو کیسے معلوم ہو اور اگر معلوم ہو تو اس کا لکھنا موجب فساد ہے۔ اتنا بھی کبھی تمہاری خاطر لکھ دیتا ہوں۔ میاں عظیم الدین اس سے زیادہ خوبیوں کے مالک ہیں جتنا آپ نے لکھا ہے۔ رسم طریقہ سے قطع نظر فقیر نے سے دیکھ بھال کر دوست بنایا ہے۔ وہ ہر میدان کا بہادر ہے خواہ دنیاوی معاملہ ہو یا دینی۔ خدا اس کو زندہ رکھے۔ اور اسے اس کے مقصد تک پہنچادے۔ ہم اس علاقے میں طریقہ کی ترویج کے لئے آرہے ہیں۔ اس ویران شہر میں طریقہ کے طالب نہیں رہے اور وہاں بہت ہیں۔ اور پھر یہ کہ وہاں تم مہماندار اور غمگسار ہو۔ اگر تم وہاں نہ ہوئے تو مجھے وحشت ہوگی۔ ہر چند کہ تمہارے رفیق اور لڑکے خدمت کرتے ہیں لیکن تم ایسے بے نظیر ہو کہ تمہارا کوئی قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ اس شہر میں فتوح عنقا کی طرح نایاب ہے اور قرض کیمیا کی طرح ناپید۔ بہر حال وقت کے تقاضے کے مطابق جو کرنا ہو جلد کرنا چاہیے یا جلد اطلاع دینی چاہیئے: تاکہ سیر وسفر کی خلش دل سے دور کردی جائے۔ اور حضرت مولوی ثناء اللہ صاحب کی دلجوئی ضرور سمجھنا۔ وہ فقیر کی یادگار ہیں۔ والسّلام۔

بنام ظفر علی خان

(۴۲)

میری جان سلامت رہو۔ اس مدت مفارقت میں تمہارے دو خط ملے اور حرز جان ہوئے۔ اس کمزور جسم میں تازہ روح آگئی۔ بہر حال فقیر کے ساتھ بد معاملگی اور ان تمام حقوق اور تعلقات کے پیشِ نظر اوضاع میں تبدیلیوں کے باوجود جن کا بیان بہت طویل ہے۔ فقیر کے مناسب حال وفا، معاف کرنا اور دعا دینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دیکھیئے انتظار ہمارے ساتھ کیا کرتا ہے۔ تم کو خدا کے سپرد کر دیا ہے۔ تم ہمیں خدا کو سونپ دو۔ نجیب آباد کے سفر، سنبھل کے دوستوں، بھائی بندوں، اعمام، والدین، صاحبان انصاری اور حضرت مولوی صاحب اور ان کے اسباب معیشت کے بارے میں لکھو۔ ہر صبح نماز کے بعد فقیر کی طرف توجہ کر کے بیٹھا کرو۔ میں بلا ناغہ توجہ دیتا ہوں۔ کسی اور سے توجہ نہ لینا۔ والدین کی اطاعت کو فرض سمجھو۔ بزرگوں سے اپنے تعلقات اور اپنی معیشت کے حالات لکھو۔ اگر دل صاف ہو تو شوقِ ملاقات چھپا نہیں رہتا۔ تمہارے دین دنیا کا خدا حافظ ہے۔ خدا زیادہ عمر اور زندگی کا لطف دے۔

والسّلام۔

بنام شاہ ابوالفتح (۱)

(۴۳)

مخدوما فقیر کو مردے سے زیادہ تصور نہیں کرنا چاہیئے ۔ اور سلام کرنے میں مردہ سبقت نہیں کر سکتا ۔ لیکن حدیث صحیح یہ ہے کہ سلام کا جواب دے سکتا ہے آپ سنیں یا نہ سنیں ۔ اب جبکہ آپ نے رسم مراسلت کو تازہ کیا ہے فقیر بھی خود کو رسم دوستی میں قاصر نہیں رکھے گا اور صحبت کے حقوق فروگزاشت نہیں کرے گا ۔ دبستان تحقیق کے اس بے سواد میں کتاب کی تصنیف کی استعداد نہیں ہے ۔ دوستوں نے بعض شریعت اور طریقت کے مسائل پوچھے تھے ان کے جواب مکاتیب کے طور پر لکھے ہیں ۔ عزیزوں نے ان کو فراہم کیا ہے ، ان کے بعض اجزا علیحدہ سے بھیجے جا رہے ہیں ۔ خدا کرے کہ قبول ہوں ۔ اور بہرہ علی خاں ۔ جو فقیر کے بھائی اور بیٹے کی طرح ہے اچھے خاندان سے اور اوصاف حمیدہ کا مالک ہے ۔ (اس) نے کسی کام سے پیلی بھیت کا قصد کیا ہے ۔ اس شہر کے لوگوں سے اس کی جان پہچان نہیں ہے ۔ اگر میرے خط کے وسیلہ سے آپ کی خدمت میں پہنچے تو آپ ان پر مہربانی کریں اور جو عنایت اور کرم اس پر ہو گا وہ بعینہ میرے حال پر ہو گا ۔ ملاقات بہت سے وجوہ سے مشکل نظر آتی ہے ، خدا آسان کردے ۔ وللہ رحمن الطاف خفیہ (اللہ کے بہت سے الطاف چھپے ہوئے بھی ہوتے ہیں) مجلس شریف سے فیض اٹھانے والے سلام قبول فرمائیں ۔ والسلام ۔

بنام شاہ ابوالفتح(۲)

(۴۴)

خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ظفر علی خاں سلمہ ربہٗ نواب اعتضاد الدولہ ارشاد خاں بہادر کے صاحبزادے اور نواب امین الدولہ کے پوتے ہیں اور حضرت شیخ الاسلام عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ انکی ظاہری اور باطنی تعلیم و تربیت اس فقیر نے کی ہے۔ اور اس کے نسخہ، سراپا کو صورۃً اور معنیً ٹھیک کیا ہے۔ بسولی میں دوندے خاں کی لڑکی کی شادی میں حافظ رحمت خاں صاحب نے ان کو اپنے ساتھ رکھنے اور روزگار دینے کا وعدہ کیا تھا (اس لئے) انھوں نے (ظفر علی خاں) پیلی بھیت کا قصد کیا ہے۔ اس لئے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ اس قدیم دوستی اور التفات (جو آپ مجھ پر کرتے ہیں) کے حق سے جو شفقت آپ کر سکتے ہوں اس جگر گوشہ پر کیجئے جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے اور اگر ان کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہنے کی ضرورت ہو تو اپنی خودداری کو پیش نظر نہ رکھیے اور اس طرح سے فرمائیے کہ سننے والا متاثر ہو جائے ورنہ کچھ نہ کہیے۔ کیونکہ سرسری سفارش سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ پھر صرف ان کی عنایت کافی ہے۔ پیلی بھیت آنے کا تو میں نے کبھی خیال بھی نہیں کیا۔ لیکن اب اس نور چشم کی وجہ سے (وہاں آنے کا) احتمال زیادہ ہے۔

والسلام۔

بنام چودھری تہور خان

(۴۵)

تمہارے حال پر ہمارا اشتیاق اور ہماری شفقت ویسی ہے جیسی کہ تھی خاطر جمع رکھو۔ میر اسداللہ صاحب جو ہمارے اور تمہارے پیرزادے ہیں بیوی بچوں سمیت بغیر کسی معاش کے اس شہر میں ہیں، اپنی استطاعت اور توفیق کے مطابق ان کی خدمت غنیمت سمجھو۔ خدا تم کو دشمنوں پر منصور اور دوستوں میں مسرور رکھے۔ تمہاری نیاز پہنچی اور وقت پر پہنچی۔ خدا قبول کرے، آباد رہو۔ خط لکھنے سے جو نصف ملاقات کے برابر ہے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ جہاں کہیں بھی رہو خدا کو یاد رکھو۔ کمزوری بہت ہو گئی ہے۔ خدا خاتمہ بالخیر کرے۔

والسلام۔

بنام مولوی قطب شاہجہان[1] پوری

(۴۶)

خدا کا شکر ہے اور قوی امید ہے کہ خدا نے ہمارے تمام دوستوں اور اس شہر کے لوگوں کو مصیبت سے محفوظ رکھا ہے۔ سورۂ لِاِیلاف کی تلاوت صبح اور شام کیا کریں۔ اس علاقہ پر مرہٹوں کے قبضے، قوم روہیلہ کا فرار اور قصبات و دیہات کے تخت و تاراج ہونے کے متعلق کیا لکھوں[2]۔ اس کی تفصیل عزیزوں کے خطوط سے معلوم ہوگی۔ خدا کا شکر ہے کہ خانصاحب کے متعلقین اس مصیبت سے نجات پاکر یہاں پہنچ گئے ہیں۔ انشاءاللہ اپنے وطن اور آپ کی خدمت میں بھی پہنچیں گے۔ آپ کا التفات نامہ آیا۔ ممنون ہوں۔ وہاں کے لوگوں کی خبر سن کر اطمینان ہوا۔ اللہ تعالیٰ سب کو سلامت رکھے۔ اور اس علاقے کے سرداروں کو نیک توفیق دے کہ نیک دل سے اپنی منزل پائیں۔ مولوی غلام یحییٰ کی خبر جانکاہ نے سینے میں آگ سی لگادی اور زہرہ آب کردیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن (تسلی کا سامان یہ ہے کہ کل ہمیں بھی جانا ہے)۔

والسلام۔

(۳)

(۱۱۸۶ھ)

بنام میر حفیظ اللہ خان

(۴۷)

صاحب من۔ برخوردار عزیز اللہ اپنی والدہ کے ساتھ قید فرنگ میں ہے۔ اس ملاقات کا آرزومند ہے اور عبید خاں کسی کی بات نہیں سنتا فقیر اور اس کے درمیان کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ مدت ہوئی کہ اپنی جائیداد کی طرف چلا گیا۔ یہاں اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ فقیر کوئی تدبیر کرنے اور اس کی والدہ کو یہاں بلانے سے معذور ہے۔ شاید دعا سے یہ مشکل ہو جائے اور دعا سے دریغ نہیں کروں گا۔ اور وہ مستورہ ایسی مصیبت میں مبتلا ہے کہ تحریر میں نہیں آسکتا۔ اگر اپنے اختیار میں ہوتا تو اسے خود لاتا تاکہ تم تک پہنچا دیتا۔

والسلام۔

بنام میر اجبنی(۱)

(۴۸)

معلوم ہے کہ بھائی اپنے ہاتھ سے خط نہیں لکھتے ۔ جو لکھتا ہے اس سے کہہ دیں کہ یہ گھسا پٹا لقب (حقائق و معارف آگاہ) چھوڑ دے ۔ کیونکہ ہمارے اور آپ کے تعلقات میں ان الفاظ کی گنجائش نہیں ہے ۔ اور وہاں کے لوگوں کا سلیقۂ تحریر معلوم ہے ۔ بے مزہ تکلف کو دخل نہ دیں ۔ اس کے بعد اس طرح لکھیں کہ میر اجبنی کی طرف سے مرزا جان جاناں مطالعہ کریں ۔ اس کے بعد مطلب لکھیں ۔ باعث تحریر یہ ہے کہ میر بھچو صاحب خواجہ احرار قدس سرہٗ کے فرزندوں میں اور فقیر کے پیرزادے اور قریبی عزیز بھی ہیں اور میرے فرزند کی جگہ ہیں ہمیشہ خاطر جمعی کے ساتھ رہتے ہیں ۔ اب زمانہ کی گردش سے پورب کا قصد کیا ہے ۔ آپ کی خدمت میں پہنچیں گے ۔ ان کے آنے کو غنیمت جان کر ان کے روزگار اور معاش کی تلاش میں مقدور بھر توجہ کیجیے ۔

والسلام ۔

بنام مولوی محمد سعید قاضی پیلی بھیت

(۴۹)

یارانِ طریقہ کو خدا اپنی یاد میں مشغول اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں مستغرق رکھے۔ حامل رقعہ محمد شاہ یارانِ طریقہ میں سے ہیں۔ انھوں نے کسب کمال کیا ہے۔ اگرچہ بظاہر علم و فضل سے خالی ہیں۔ لیکن ان کا باطن طریقہ کے نور سے معمور ہے۔ بیوی بچوں کے باوجود معیشت کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے۔ چاہتے ہیں کہ اس حدود میں سکونت اختیار کرلیں۔ اگر آپ کی کوششوں کی وجہ سے اس مملکت کے دنیا داروں کی سرکار سے تھوڑی سی معاش کا کوئی ذریعہ ہو جائے کہ جس میں علائق کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں (تو) یہ اجرِ عظیم کا سبب ہے اور فقیروں کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی۔ حضرت مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد نقشبندی سرہندی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرزند صاحبزادۂ عالیقدر۔ میاں مرید حسین صاحب کی خدمت اور ان کے وظیفۂ معاش کے لئے کوشش بزرگوں کی خوشنودی کا موجب ہے کیونکہ بہت زیادہ علائق کے باوجود علاقۂ روزگار اور وجہ معیشت نہیں رکھتے اور متعلقین کے ساتھ کسی تقریب سے شاہجہان پور میں ہیں۔ فقیر کے پہنچنے تک یارانِ طریقہ جو پیلی بھیت میں ہیں مولوی عبد الرزاق سے رجوع کریں۔ کیونکہ ظاہر اور باطن میں وہ لیاقتِ ارشاد و تعلیم طریقہ رکھتے ہیں۔ ان کی صحبت کو غنیمت جانیں اور دوسرے عزیز کہ جنہوں نے فقیر سے استفادہ کیا ہے اور اجازت حاصل کرلی ہے۔ ان کی صحبت

بھی فائدے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن بزرگی کے لئے بہت سے مصالح درکار ہیں۔ اگر فقیر کسی شخص کے حق میں سفارش لکھے تو اپنی طاقت کے مطابق اس کام میں کوشش کریں۔ کیونکہ آپ کے لئے فائدہ ہوگا۔ جہاں تک مؤثر ہونے کا تعلق ہے یہ تو قسمت کی بات ہے۔

والسّلام۔

بنام مُلّا محمّد یار

(۵۰)

شریعت اور طریقت کی ترویج کے کام کے علاوہ زندگی سے کچھ اور مقصود نہیں ہے۔ اور برادرانِ طریقہ اس نفیر کو برادرانِ نسبتی کی طرح عزیز ہیں۔ حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اتباعِ سنت میں استقامت دے۔ باعثِ تحریر یہ ہے کہ کافرانِ سکھ (خدا انھیں ذلیل کرے) کے ظلم و ستم سے سرہند کا متبرک شہر ویران ہوگیا ہے۔ اور بزرگوں کے مزارات شہید ہوگئے ہیں۔ اور صاحبزادے شہر شہر آوارہ پھر رہے ہیں۔ ایک جماعت نے اس طرف کا قصد کیا ہے۔ خاص طور پر حضرتِ میر اسداللہ صاحب کو جو فقیر سے بہت خصوصیت رکھتے ہیں تشریف لا رہے ہیں اگرچہ اس شہر اور اہلِ شہر کا حال مخفی نہیں ہے لیکن اس ضرورت سے لکھ رہا ہوں کہ اہلِ طریقہ کو ہاتھ اور زبان کے مقدور کے مطابق کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہیئے۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جب کہ ان کے بزرگوں کو غارت گری اور جلاوطنی کا صدمہ پہنچا ہے۔ والسلام

بنام مولوی عبدالرّزاق

(۵۱)

میاں محمد اکبر یارانِ طریقہ میں سے ہیں۔ وہ کسی وجہ سے وہاں پہنچے ہیں۔ ان کا نصف دائرۂ امکان پورا ہو چکا ہے اگر آپ سے توجہ کی درخواست کریں تو ضرور دیجئے اور دنیاوی کاموں میں بھی ان کے لئے کوشش کریں۔ اور جہاں تک بھی مقدور ہو کلمۃ الخیر سے دریغ نہ کریں۔ اور فقیر کے لئے خاتمہ بالخیر کی دعا کو لازمی سمجھیں کہ موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ عمر اسی سے تجاوز کر گئی ہے۔ ملاقات کی توقع نہیں کہ مجھ میں طاقت سیر و سفر نہیں اور آپ کو فرصت نہیں۔

والسّلام۔

بنام مولوی احسن خاں بریلوی

(۵۲)

فقیر امروہہ اور مراد آباد کی سیر سے فارغ ہو چکا ہے اور اب شاہجہان پور جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ جلد پہنچے گا۔ روانہ ہونے سے پہلے دو تین مقام بریلی میں اور پانچ چھ مقام شاہجہان پور میں ہونگے۔ اس کے بعد فقیر سنبھل واپس چلا جائے گا اور پھر دہلی کے لئے روانہ ہو جائے گا۔ بڑھاپے کی کمزوری کے باوجود اس مشکل سفر کو آخرت کی نیک اغراض کے لئے پسند کیا ہے جیسے خدا جانتا ہے۔ مجھے بھی دوستوں سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا کہ انھیں ملاقات کی خواہش رکھنے والے دوستوں میں جو بھی بریلی میں ہو اسے میری آمد کی اطلاع دے دیجئے کیوں کہ میں وہاں کے رہنے والے دوستوں سے واقف نہیں ہیا۔ اس لئے انھیں اطلاع دینا میرے بس میں نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ملاقات میسّر نہ ہو۔

والسّلام۔

بنام مولوی محمدؐ کلیم بنگالی

(۵۳)

اس علاقہ کے لوگوں کی حالت خراب ہے۔ خدا امتِ محمدؐیہ پر رحم کرے اس کے آقا پر درود اور سلام۔ خط لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت میر مسلمان صاحب نے بارک اللہ فی برکاتہم (اللہ ان کی برکات میں برکت دے) ناتوانی اور بے سامانی کے باوجود محض اپنی ہمت قوی کی تحریک پر فقیروں کی جماعت کے ساتھ حج کا ارادہ کیا ہے۔ اگر وہ اس علاقہ سے گزریں اور آپ کو اس کی اطلاع ملے تو اس سراپا برکات ذات کی ملاقات ضرور حاصل کریں۔ اور کسی بھی وجہ سے خود کو ان کی خدمت سے معذور نہ رکھیں کیونکہ ان کی ذات شریف میں کمالات ظاہری اور باطنی جمع ہیں۔ انھوں نے فقیر کے پیر و مرشد سیدؐ السادات سے مقامات حاصل کئے ہیں۔ اور سلوک کی تکمیل جناب شیخ الشیوخ یعنی میرے مرشد سے کی ہے۔ اس مضمون کی اطلاع نواب صاحب یعنی قاسم علی خاں صلہم اللہ تعالیٰ الی غایۃ ماتیمناہ (اللہ ان کی تمناؤں کو پورا کرے) کو دے دیجیئے بلکہ فقیر کا یہ خط انھیں پڑھوا دیجئے کیونکہ ایسے وقت میں انھیں خط لکھنا مناسب نہیں۔ والسلام

بنام میر پیر علی

(۵۴)

تم نے اپنے روزگار کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ٹھیک ہے۔ لیکن فقیر میں چلنے پھرنے کی طاقت اور سیر وسیاحت کا بالکل دماغ نہیں۔ میں ان مریدوں کی تعلیم و تربیت کے لئے یہاں (سنبھل) آیا ہوں جو ہر طرف سے آکر جمع ہوتے ہیں۔ دو ماہ بعد دہلی چلا جاؤں گا کیوں کہ عزیز واقارب وہیں ہیں اور ہر طرف سے فتنہ وفساد دہلی کا قصد کر رہا ہے[1]۔ بایں ہمہ اس علاقے (سنبھل) کے دنیا دار فقیر سے شناسائی نہیں رکھتے تو عقیدت کا کیا سوال ہے۔ تمہیں یاد نہیں کہ جس دن ہماری ملاقات ہوئی تھی میں نے یہ قصہ تمہیں سنایا تھا کہ خانساماں و بخشی یعنی فتح خاں[2] اور سردار خاں[3] کو میں نے تمام عمر نہیں دیکھا۔ دوندے خاں مجھ سے ملنا چاہتا تھا میں نے منع کر دیا۔ حافظ رحمت خاں مجھ سے ملنے آئے تھے مجھے ان کی صحبت پسند نہیں آئی۔ اور علی محمد خاں[4] کے لڑکوں کو میں نہیں جانتا تو پھر کیسا تعلق اور کیسی سفارش۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس شہر میں بیگانہ، بیروزگار اور اہل وعیال کے ساتھ ہو۔ حقوق آشنائی سے قطع نظر تم ایسے لوگوں کے لئے کوشش کرنا عبادت ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے جو میں نے لکھی ہے۔ اور سنبھل کے لوگ تو خود ہی مجبور اور لاچار ہیں ورنہ یہ گھر تو تمہارا ہی گھر تھا۔

والسلام

بنام میر محمد مبین خان

۵۵

کیا لکھوں کہ میر سلمان صاحب کی وفات کی خبر جاں گداز سے دل پر کیا گزری[۱]

یار رفت و ماچو نقشِ پا بخاک افتادہ ایم
سایہ میگر دید کاش ایں نارسا افتادگی

خدا کا شکر ہے ہم بھی بر سر راہ ہیں۔ اس سے پہلے ہی میر مکھو اور میر محمد معین خاں[۲] صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے خط سے مغلانی بیگم مغفورہ مرحومہ کے انتقال کی خبر نے دل کو داغ اور جان کو بے دماغ کر دیا تھا۔ بیگم جان صاحبہ کو جو صدمہ پہنچا ہے اس کے خوف سے زہرہ آب ہوتا ہے۔ بہر حال سب مصیبتیں گزر جاتی ہیں اور ہم بھی گزر جائیں گے۔ جو سانس بھی خدا کی یاد میں گزر جائے غنیمت ہے۔ سردار خاں بخشی کی طرف سے خانقاہ کے صوفیوں کے خرچ کے لئے جو کچھ ملتا تھا اور چند روز ہوئے بند ہو گیا تھا اُس کے بحالی کی خبر سُن کر مسرّت ہوئی کیونکہ اس آخر زمانے میں توکل بے جمعیتی کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور صوفیوں کا راس المال تو یہی جمعیت ہے۔ یارانِ زمانہ کی ناسازی اور بے وفائی محلِ شکایت نہیں ہے۔ بے فکری کی اصل قطع امید ہے۔ دوستوں کے عدم اور وجود کو ایک سمجھنا چاہیئے۔ احباب کی خدمت میں جو کوشش ہوتی ہے اس کا بدلہ خدا سے مانگنا چاہیئے۔ میر سلمان صاحب کا کس عارضہ میں انتقال ہوا

اور کہاں مدفون ہیں۔ پوری کیفیت لکھو۔ چند سانسیں جو باقی ہیں انھیں خدا اپنی رضا میں گزروا دے۔ اور جو لوگ باقی رہ گئے ہیں ان کی رحلت کا داغ دل کو نہ پہنچائے۔ فتوحات باطنی روز افزوں ہیں۔ اس علاقہ میں بھی صبح شام تقریباً سو آدمیوں کو توجہ دی جاتی ہے۔ تمہارے لئے بلکہ سب کے لئے خدا کافی ہے۔ رزق اور فتوح ملک کی آبادی پر موقوف نہیں ہیں۔ خاطر جمع رکھو۔ خدا کارساز ہے۔ اس علاقہ میں خیر نہیں۔ لطیفۂ غیبی کے منتظر رہو۔ خدا تم کو معزز اور غنی رکھے گا۔ اگر کوئی سفر درپیش ہو جائے تو استخارہ مسنونہ کے بعد وقت اور زمانے کے تقاضے کے مطابق جس طرف بھی میسّر ہو چلا جانا چاہیئے اور چاہیے کہ ہم دونوں دعائے خیر میں ایک دوسرے سے غافل نہ رہیں۔ پیر محمد چند روز ہوئے یہاں آیا تھا۔ حلقہ میں حاضر رہنے کی پابندی کی۔ اس پر فیض کا فتح باب اچھی طرح نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ اس سے عاجز ہیں۔ وہ میرا خط لے کر عذر تقصیر کے لئے پہنچا ہے۔ اسے معاف کر دیجئے۔ کیونکہ معاف کرنا کریموں کا شیوہ ہے۔ اسے جلدی رخصت کر دیجئے کیونکہ وہ سفر کا ارادہ رکھتا ہے۔ نواب ارشاد خاں مغفور کا انتقال ہو گیا۔ آدمیت ان کے ساتھ دفن ہو گئی۔ خدا ان کو بخش دے اور ہماری تنہائی بھی دیکھنے کے قابل ہے ؎

آنچہ مارا جان و دل می سوخت دردِ ہجر بود
آخر از ناسازیٔ طالع باآں ہم ساختیم

والسّلام۔

بنام میر محمد معین

۵۶

فقیر مع متعلقان بخیر و عافیت ہے اور دوستوں کے لئے دعا میں مشغول ہے. لیکن دعا وقت آنے پر قبول ہوتی ہے ۔ خدا تمہارا کام خاطر خواہ کر دے کہ تم مدتوں سے تکلیف اٹھا رہے ہو۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (ہر رنج کے بعد راحت ہے) خدا تمہارے کاموں کا انجام بخیر کرے ۔ خاطر جمع رکھنا چاہیئے ۔ کمزوری اتنی ہے کہ لیٹے لیٹے ہی تعلیم دیتا ہوں ۔ اگرچہ زندگی کا کوئی لطف باقی نہیں رہا لیکن صوفی کی زندگی غنیمت ہے، خود اس کے اپنے وجود کے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی ۔ تمہاری بیوی کو خدا نے طفرہ کے قاعدہ سے ولایت کبریٰ تک پہنچا دیا ہے. وہ بہت اچھی استعداد رکھتی ہے ۔ اور عقیدت و اخلاص کے معاملے میں مردوں کی پیش رو ہے ۔ میر مکھو کمالاتِ نبوت کے ابتدائی مقام تک پہنچ گئے ہیں ۔ میاں جگن دائرۂ امکان ختم کرنے کے قریب ہیں ۔ اور میر مبین خود بڑے بزرگ ہیں ۔ آج کل صبح شام خوب حلقہ ہو رہا ہے ۔ خوش استعداد لوگ آگئے ہیں ۔ خدا انھیں فرصت دے کہ سیر سلوک کو پورا کریں ۔ تمہاری جگہ خالی ہے اِس آخری عمر میں فیض و برکات اس قدر زیادہ ہیں کہ تحریر میں نہیں آتے ۔ الحمد للہ علیٰ نوالہ والصلوٰۃ علیٰ رسولہ وآلہ (اللہ کا شکر ہے اس کی نعمتوں کا اور درود اس کے رسول پر) برخوردار دارین، کامیاب نشانین فرزندار جمند میر عبد العلی کے دیکھنے کے اشتیاق کے بارے میں

جو کچھ لکھوں کم ہے۔ خدا اس کو دین اور دنیا کے اعلیٰ مقاصد پر پہنچائے۔ اس کی فرط محبت سے شرمندہ ہوں۔ اس کے اخلاص کے حقوق مجھ سے ادا نہیں ہوتے۔ خدا کرے کہ بادشاہ کے لشکر کے ساتھ شہر میں آئے اور پھر اس کے بعد اسے خود سے جدا نہ کروں۔ دل ہی اس کی قدر جانتا ہے۔ آدمیت کے جو آداب تم سے ظاہر ہوتے ہیں ان میں کسی کو شریک کرنا بڑا ظلم ہے (یعنی ایسے آداب کسی اور سے ظاہر نہیں ہوتے) اللہ تمہارے نسخۂ وجود کو اور صحیح کرے۔

آج کہ شوال کی دس تاریخ ہے فقیر حضرت خاں صاحب (یعنی تمہارے والد جو ہزاروں خوبیوں کے مالک تھے اور جو اپنی یادگار کے دل پر داغ چھوڑ گئے ہیں) کی تعزیت کے لئے آنولہ میں حاضر ہے۔ تین دن کے توقف کے بعد کل سنبھل واپس چلا جاؤں گا۔ تعزیتی عبارت لکھنا تکلف سے خالی نہیں ہے کیوں کہ ہم اور وہ ہم عمری کی وجہ سے اس دنیا میں آنے کے وقت چند ہی قدم تقدیم اور تاخیر کے ہم سفر تھے۔ اب جب کہ اصلی وطن کو واپسی کا وقت آیا ہے چند ہی نفس کے فاصلے سے ہم قافلہ ہوں گے ؏

امروز گر از رفتہ حریفاں خبرے نیست
فرداست دریں بزم زما ہم اثرے نیست

والسلام۔

میر محمد معین خاں کے متعلقان کے نام

۵۷

آخری عمر ہے اور بڑھاپے کی کمزوری حد سے زیادہ ہے۔ خدا خاتمہ بالخیر کرے۔ ملاقات کی توقع بہت کم ہے۔ لیکن خدا کی قدرت سے قوی امید ہے۔ وہ مجلد کتاب جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے اور اس فرزند کا خط اس مہینے میں پہنچا۔ خدا جزائے خیر دے۔ میر محمد مکین خاں صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر میں نے پہلے سن لی تھی۔ خدا تینوں بھائیوں کو بخشے۔ ہمارے دل پر پے در پے داغ یادگار چھوڑ گئے۔ خدا ان کی اولاد کو نیک توفیق دے۔ محمد امین بہت یاد آتا ہے۔ میر علی اصغر کی مستورہ (خدا انھیں بخشے) کے لئے قرآن ختم کرا دیئے جائیں گے۔ چاہئیے کہ باقی عمر خدا کی یاد میں گزار دے کیوں کہ زندگی کا بھروسہ نہیں ہے۔ فقیر مع توابع پوری کمزوری اور ناتوانی کے ساتھ زندہ ہے اور ابھی تک تقریباً سو آدمیوں کو دونوں وقت توجہ دی جاتی ہے۔ اور ہم میں توفیق نہیں مگر اللہ کی دی ہوئی۔

والسّلام۔

بنام نامعلوم

(۵۸)

ذوق سخن باقی نہیں رہا۔ بہت عرصہ کے بعد ایک تازہ غزل ہوئی ہے۔ دو تین شعر لکھے جاتے ہیں ؎

بایں فرصت چہ خط باشد زسیر گلستاں مارا — کہ رفتن لازم افتاد است چوں آب رواں مارا
قفس دانیم و بس راہِ چمن از ما چہ می پرسی — کہ پیش از بال و پر برداشتند از آشیاں مارا
نفس تا میکشم از سینہ صد جا بگسلد تارش — چہ زار و ناتواں کرد ست آں موئے میاں مارا

والسّلام۔

بنام سید حشمت خاں بہادر شہوار جنگ

۵۹

خدا آپ کی ضرورتیں بے طلب پوری کر دے۔ ع
"مید ہد یزداں مُرادِ متقی"
جو کچھ فقیر کو نواب مذکور کے بارے میں تم نے لکھا تھا معمولی تعلقات ہونے کی وجہ سے اسے غیر مفید جان کر کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ معاف فرمائیں۔ کیونکہ وہ بزرگ ہماری جنسِ درویشی کا خریدار نہیں ہے۔ اس کا میلان دوسرے طریقہ کی طرف ہے اور اس کا اخلاص دوسرے بزرگوں کے ساتھ ہے اور ان (بزرگوں) کا ایک اشارہ فقیر کے سو دفتروں سے بہتر ہے۔ ان بزرگوں کی آپ سے بھی شناسائی ہے۔ ان لوگوں کی باتوں میں جو آپ تائید کریں اس کا ثواب جہاد کے برابر ہو گا۔ تقبل اللہ منکم وجزاکم خیر الجزاء۔ (خدا اسے قبول کرے اور تمہیں بہترین جزا دے۔) والسلام۔

بنام انتظام الدولہ

(۶۰)

خدا زمانے کو آپ کے لئے سازگار رکھے۔ یہ خاکسار تنہائی اور گمنامی کو پسند کرتا ہے۔ اہلِ ثروت سے نہیں ملتا۔ اس لئے اتنے قدیم تعلقات کے باوجود آج کے علاوہ نہ کبھی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا اور نہ کبھی کسی کام کی تکلیف دی۔ فقیر کے ہمشیرزادے ہیں، اگرچہ کوئی کمال نہیں رکھتے لیکن آدمیت سے خالی نہیں ہیں۔ اقتضائے زمانہ سے پریشان ہیں۔ خصوصاً ان میں سے ایک تو اضطراری کیفیت میں گرفتار ہے۔ ان کے حالات کی تفصیل عزیز از جان ارشاد خاں بہادر سے معلوم ہو جائے گی۔ جس برخوردار کو جاگیر سرکار کی بہت تمنّا ہے اسے کل آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ اگر تقدیر نے اس تدبیر سے موافقت کی تو یقین ہے کہ آپ بلا توقف مناسب دستخط (درخواست پر سفارش) کردیں گے۔ ورنہ میری طرف سے نہ سماجت ہے نہ شکایت۔ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور حکم دیتا ہے جس کا ارادہ کرتا ہے) یہ ضرور ہے کہ اس نوجوان کی رفاقت کو جو بالواسطہ درویشوں کی امداد واعانت ہے بازوئے فتح ونصرت کا تعویذ سمجھیں گے۔ والسّلام۔

بنام نواب انتظام الدولہ

(۶۱)

اس دنیا کے امیروں کو اس جہان کے بادشاہوں یعنی فقیروں کے سامنے باادب رہنا چاہیئے خاص طور پر اس وقت جب امداد و اعانت چاہیں تاکہ فقیروں کا دل ملتفت ہو۔ ایسے اوقات میں بے پرواہی کرنا اور مقاصد کی تحریر کو بے ادبی سے پیش کرنا نقصان دہ ہے۔ اگر حُسنِ ظن درمیان ہے تو ادب واجب ہے اور اگر نہیں ہے تو پھر ان کی خدمت میں حاضر ہونا اور توبہ تِلاّ کرنا کیا ضروری ہے۔ انھیں باتوں کے خوف سے میں نے ملاقات اور خط و کتابت ترک کر رکھی ہے ؎

زخلق گندہ دماغی چگونہ بردارم
بایں دماغ کہ از بوئے گل زکام کند

اور معلوم ہو کہ فقیر کو بشارت یا استخارہ سے کوئی مناسبت نہیں۔ لیکن فال نکالنا امر مسنون ہے۔ اگرچہ قرآن شریف سے فال نکالنا حدیث میں نہیں آیا ہے لیکن ممنوع بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی نکالے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ آپ کے اشعارِ آبدار نظر سے گزرے۔ درست اور بامزہ ہیں۔ فارسی ہندی سے بہتر ہیں۔ اصلاح کی گنجائش نہیں۔ محمد باقر جو آپ کے قدیم اور مخلص ملازم ہیں بعض عذرہائے مسموع کی وجہ سے دور اور مہجور ہیں۔ لیکن اس تقصیر اضطراری کے کفارے کے لئے ہمیشہ فقیروں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور آپ کے دوام عمر و دولت کے لئے دعا اور توجہ کی درخواست کرتے ہیں۔ والسّلام۔

بنام نواب عماد الملک[۱]

۶۲

مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے بعض سردار تم سے خوش ہیں اور بعض ناخوش۔ یہ امر معہود کا ظہور ہے۔ ضرورت پڑنے پر ان لوگوں کو اپنی طرف راغب کر کے کام نکال لینا چاہیئے۔ حریفوں سے مصالحت کر کے اپنا نقشِ مراد حاصل کرنا چاہیئے۔ اور جو باتیں تم نے لکھ کر بھیجی ہیں ان کو راز رکھنا چاہیئے۔ ورنہ مخالفوں کی طبیعت پر بہت گراں گزریں گی؛ چھوڑپن کی وجہ سے انھیں حسد کے پسینے آجائیں گے اور تدبیر کی بنیادوں میں فرق پیدا ہو جائے گا۔ فقیر نے اپنی وضع اور طبیعت کے خلاف یہ بات مکرر لکھی ہے کہ اپنی تدبیر کی کارروائی سے مطلع کریں تاکہ مفید اور مضبوط بنیاد رکھی جا سکے۔ تم نے بے محل احتیاط سے کام لے کر اس بات کو چھپایا۔ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

اسد یار خاں جو آپ کے حواریوں میں سے ہے اگر کسی اضطراری کیفیت کی وجہ سے چند روز کے لئے آپ کی خدمت سے دور ہو گیا، اس بنا پر اس کے دیرینہ حقوق فراموش کرنا اور ایک ایسے جرم کی وجہ سے جس کے ہزاروں عذر موجود ہیں بے التفاتی کی سزا اسے انتقام لینا کریموں کی شان کے خلاف ہے اور انصاف سے بعید بھی ہے۔ آپ کی دوستی نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا ہے جو اس کے بارے میں دو چار حرف لکھے ہیں۔ اگر بنائے دولت

اور اساسِ نیک نامی کی تقویت منظور ہے تو اس خط کے جواب کے ساتھ خان مذکور کے نام حسنِ طلب پر مشتمل عنایت نامہ بھیجئے۔ زیادہ یہ ہے کہ توفیقِ مہربانی تمہاری رفیق رہے۔

والسّلام۔

بنام نواب عماد الملک

۶۳

سیّد حشمت خاں صاحب کے لڑکے میر مبین خاں صاحب کہ جن کا نسخۂ وجود اصول اور فروع کی صحت تک پہنچ چکا ہے اور جنہوں نے استعداد کے رسالے کو کمال اور اتمام تک انجام دے لیا ہے بشریت کے تقاضے سے کہ جس سے اہلِ کمال کو اور خاص طور پر بیوی بچے والوں کو مفر نہیں ہے۔ انھوں نے ناتوانی اور بے سرو سامانی کے باوجود سفر کیا ہے اور قدیم تعلقات کے پیشِ نظر آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ یقین ہے کہ عنایاتِ موروثی کے مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور حیثیاتِ شخصی کا لحاظ کر کے ان کے دلِ شکستہ کی تعمیر میں اور اس بات میں کہ انھوں نے کسی طرف التفات نہ کر کے آپ کے آستانۂ عالیہ کا احرام باندھا ہے (ان کے لئے) نہ صرف اکرام و احترام سے بلکہ تعیم اور انعام سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اور یہ باتیں اگرچہ اس قدر دانی کی وجہ سے ظاہر ہوں گی جو سرداری کا خاصہ ہے لیکن یہ عمل فقیر کو بھی زر خرید کرے گا۔ اس نوجوان کے والدِ بزرگوار خان صاحب مشفق و مہربان کے بارے میں لکھنا بیکار ہے۔ ظاہرا اس خاندانِ عالیشان کے مفصل احوال آپ نے نہیں سنے ورنہ بندگی اور خداوندی کے اس قدیم تعلق کے پیشِ نظر یہ تمام لاپرواہی نہ ہوتی۔ اگرچہ آج کل سرکار کے ملازموں کا جو حال ہے وہ بھی معلوم ہے۔

والسّلام۔

بنام نواب عماد الملک

(۶۴)

مخدوم زادۂ کمالات دستگاہ میاں احسان اللہ احمدی کو ہم نے رخصت کر دیا ہے کہ آداب رفاقت کی رعایت سے ارباب نسبت کی خدمت میں رہنا حصول فتوحات اور رفع مضرات کا باعث ہے چاہے سمجھیں یا نہ سمجھیں ۔ آپ کو چاہیئے کہ ہمارے مخصوص لوگوں کے ساتھ امر معاش اور زبانی التفات دونوں میں خاص توجہ رکھیں۔ یہ فقیر کی خوشنودی کا باعث ہے ۔ اور درویشوں کی رضامندی دین اور دنیا کی ترقی کا باعث ہوتی ہے بشرطیکہ حسنِ ظن اور صدقِ عقیدت ہو۔ یقین ہے کہ کہ میر مبین خاں پر جو علاقۂ محبت کی وجہ اور ہمارے طریقہ کی نسبت کے کمال کی باعث ہمیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے الطاف خاص ہوا ہو گا۔ معلوم نہیں کہ میرزا محمد علی بیگ کی قدر و قیمت کا آپ کو اندازہ ہے۔ یا نہیں وہ صفات شریف یعنی حیا وفا، صدق و صفا حسنِ فراست اور پاکی طینت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ حاکمانِ زماں خوشامد کر کے اچھے عہدے اسے تفویض کرتے ہیں مگر وہ وفائے عہد اور اخلاص و عقیدت کی بنا پر آپ کی ملازمت کا قصد کر کے نکلا ہے۔ یقین ہے کہ حق شناسی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہو گا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ اس سیّد بزرگ کا آنا کامیابی کے دروازوں کی کنجی ثابت ہو گا۔ تدبیر میں بھی اور تاثیر میں

بھی۔ چونکہ میر مذکور بار بار لٹا ہے اور بڑے نقصان اٹھائے ہیں اس لئے اس میں مطلق استعداد نہیں رہی ۔ اس کی خبرگیری میں تاخیر کرنا ظلم ہوگا۔

والسلام۔

بنام نوابؒ عماد الملک

(۶۵)

فقیر نے نیک نیتی کی وجہ سے امرِ معہود میں گفتگو کی تھی۔ اگرچہ وہ میری وضع کے خلاف تھا۔ لیکن اب اس بات کو پورا کرنا ضروری ہے۔ جانتا ہوں کہ تمام شعور اور فراست کے باوجود آپ کو خود غرض لوگوں کے مشورے قبول کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ع

"بشنوی یا نشنوی من گفتگوے میکنم"

معلوم ہوا ہے کہ آپ کے اقران و امثال یعنی دوسرے سلاطین (قلعہ کے شہزادے وغیرہ) اپنے رشتہ داروں کے ذریعہ امرِ معہود یعنی امرِ خلافت میں آپ سے خط و کتابت کر رہے ہیں۔ اور آپ مصلحت کی وجہ سے ہر ایک کی بات قبول کر لیتے ہیں۔ دنیا داروں میں اس کا کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آپ ہر شخص کے حق اور عدمِ حق سے غافل نہ ہوں گے۔ اور اس نسخۂ بندگی کو منظور نہیں کیا جاسکتا جسے آپ نے اپنی زندگی کے لئے مناسب سمجھا ہے اور جس کی وجہ سے آقا کی ناقابلِ تسلیم باتوں کو بھی قبول کر لیا ہے۔ کوئی بھی انھیں قبول نہیں کر سکتا۔ ہاں دو آدمی ان باتوں کو تسلیم کریں گے۔ ایک تو وہ ذلیل آدمی جو نفسِ حیوانی کی وجہ سے چند روز کے خورد و خواب کو غنیمت سمجھ کر حاکم ہونے کے باوجود محکومیت کا ننگ برداشت کرتا ہے۔ ایسے آدمی سے جو توقع ہے وہ

ظاہر ہے۔ کل کی بات ہے اس نے کچھ کمینوں کے بہکانے سے پھوٹ ڈالی اور تمام عہد و پیمان توڑ ڈالے۔ اس کے بعد اگر کوئی تدارک عمل میں آئے تو پہلے دالی بدنامی ہوگی۔ اگر حیا اور وفا سے تغافل کریں گے تو پھر نجات نہیں ہوسکتی۔ دوسرے اس شخص کے لئے یہ بات قابلِ قبول ہوگی جو علم، دیانت اور عقل و فراست سے موصوف ہو۔ خلقِ خدا پر رحم کرے اور تمہارے جیسے امیر کبیر کی قدر پہچانے اور اپنے ساتھ ملاکر نیک نفسی کے تقاضے سے نفسانی خواہشوں کو چھوڑ کر دنیا اور دنیا والوں کی اصلاح میں کوشش کرنے کو عبادت اور سعادت جانے۔ جو چیز بھی اسے سونپی جائے اسے ان چیزوں کو ذہن میں رکھ کر قبول کرے۔ بلا سے یہ حمیتِ بندگی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ خصوصیات آج صرف اس فردِ خاص میں مجتمع ہیں اور فقیر بے گانگی کے باوجود ایک ایک کے حال سے باخبر ہے۔ پس اس بزرگ سے وفائے عہد کی توقع رکھنی چاہیئے۔ اور ایسے عزیز کی خدمت کے لئے کمر باندھ لینی چاہیئے۔

والسلام۔

بنام صاحبزادہ غلام عسکری خان محمدی[1]

۶۶

فقیر نواب یعنی عماد الملک کی آرزو سے بہت شرمندہ ہے۔ ارادہ ہے کہ گھر واپس جاتے ہوتے متھرا سے گزروں اور متھرا میں ٹھہر کر اپنے درود کی خبر پہنچاؤں۔ اور وہ (عماد الملک) متھرا میں آئیں۔ ایک دو روز ملاقات کر کے فقیر کو رخصت کریں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فقیر جاٹ[2] (سورج مل جاٹ) کے قلعوں میں ہرگز داخل نہ ہوگا۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ فقیر پانی (جمنا) کے کنارے تک نواب کی کوئی خاطر مدارات قبول نہیں کرے گا۔ خواہ وہ راضی ہوں یا نہیں۔ اگر تم سے ہوسکے تو نواب کو ان شرائط پر راضی کر کے اطلاع دو تاکہ ہمارا وہاں جانا بیکار نہ ہو۔ بعض آثار سے ملاقات کی توقع بہت کم ہے۔ خدا تم کو بزرگوں کے طریقے پر ثابت قدم رکھے۔ کیونکہ دنیا داری کے شغل اور "بیگانگانِ طریقہ" کی صحبت بہت بڑی مصیبت ہے۔ افسوس ہے کہ تم نے دنیا کے لئے آخرت کو چھوڑ دیا ہے اور دنیا ہاتھ نہیں آتی۔ اگرچہ وجہ معاش پر آخرت کی بنیاد ہے۔ سُنا ہے نواب نے اپنے رفیقوں کا غیر حاضری کی وجہ سے قلیل سا وظیفہ بند کر دیا ہے (حالانکہ) ان رفیقوں میں ہر ایک کا وجود ایک الگ فائدہ رکھتا ہے۔ شاہ محمد یارانِ طریقہ میں سے ہیں۔ وہ بھی ان لوگوں میں آگئے۔ اگر ہوسکے تو کہنا ان کا بھلا اسی میں ہے کہ یہ طریقہ چھوڑ دیں۔ اس سے نقصان ہوتا ہے۔ اور

اندیشہ یہ ہے کہ محمد احسان احمدی کا بھی وظیفہ بند ہو جائے گا۔ قس علیٰ ہذا۔

والسلام۔

بنام صاحبزادہ غلام عسکری خان محمدی

۶۷

سُنا جاتا ہے کہ نواب کے مقربین اس بزرگ معہود کے حوالی موالیوں کو نواب سے روشناس کررہے ہیں (حالانکہ) ان لوگوں کے سلسلے میں نواب سے حلفیہ معاہدہ ہوچکا ہے۔ کسی خاص وقت میں نواب کو اس امر سے متنبہ کردینا اور وہ جو کچھ جواب دیں لکھ دینا۔ اگرچہ دنیاداروں کے جواب کا بھروسہ نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ صرف وہ کام کرتے ہیں جس میں ان کا فائدہ ہو، بعد میں بلا سے نقصان ہی کیوں نہ ہو، عہد و پیمان فراموش کردیتے ہیں۔ نواب سے کہیے سنا ہے کہ راجا سے کدورت دور ہوگئی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوگیا ہے تو اسے خدا کی دین سمجھیں اور اس ہندو سے کام لیں کہ اس زمانہ میں کوئی اس سے بہتر نظر نہیں آتا۔ اور پھر اسے آزردہ نہ کریں۔ جھوٹ بولنے والے دریدہ دہن خود غرض لوگوں سے کام خراب نہ کریں۔ جب تک عہد و پیمان پر استقامت نہ کریں گے اور ساتھ رہنے والے جو کچھ چاہیں وہ نہ دیا جائے گا اس وقت تک حصول مطلب محال ہے۔ اور کہیئے (نواب سے) ایسی تدبیر کریں کہ لوگوں کو ان کے قول اور فعل پر اعتماد پیدا ہوجائے تاکہ وہ امید و بیم کی حالت میں اس (بزرگ معہود) کی طرف رجوع نہ کریں۔ یہ بھی کہیئے کہ خدا سے عہد مؤکد کریں کہ اب اس کے بعد لوگوں سے انصاف اور ایمانداری سے پیش آئیں گے۔ اگر وہ سچے

رہے تو اس کی برکت سے ان کے مشکل کام حل ہو جائیں گے۔ ہر کام وقت آنے پر پورا ہوتا ہے۔ تاخیر سے مایوس نہ ہوں۔ روپے پیسے اور خزانے کی کمی سے ہراساں نہ ہوں۔ موجودہ قاضی القضاۃ مجیدالدین خاں جو علم میں کمال رکھتے ہیں، دیانتداری اور انصاف میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اور فقیر سے ان کا تعلق برادرانہ رشتے سے زیادہ ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کے بارے میں نواب کو خبر دے چکا ہوں۔ اگر مملکت پر تصرف کے بعد ان کو بحال نہ کیا گیا تو فقیر بھی اس شہر میں نہیں رہے گا۔ کیونکہ قاضی کا وجود آب رحمت ہے۔ یہ بات خود غرضی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض خدا کے لئے لکھی ہے۔ اگرچہ زیادہ امکان اسی کا ہے کہ ملک پر قبضہ ہونے کے بعد ہماری اور نواب کی ملاقات نہیں ہوگی کیونکہ ہم دونوں کے مزاج میں مناسبت نہیں ہے لیکن ان کی کامیابی ہی ہمارا مقصود ہے۔ بشرطیکہ ان کا وجود خلائق کے لئے فائدہ مند ہو۔ والسّلام۔

بنام صاحبزادہ غلام عسکری خان محمدّی

۶۸

تمہارا خط پہنچا۔ مضامینِ وحشت آگین سے جو مجھ پر گزرنی تھی گزری۔ چونکہ ہم غرض نفسانی نہیں رکھتے اور ہمارا عمل نیک نیتی پر مبنی ہے اس لئے ہم نے صبر کیا اور اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ وگرنہ نواب نے جو بے اعتنائی تمہارے ساتھ کی وہ گویا فقیر کے ساتھ کی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ اب کچھ لطف باقی نہ رہا۔ میں اس جھگڑے سے درگزرا ہمیں دردِ سر کی ہوس نہیں۔ خدا جانتا ہے کہ اپنے طور کے خلاف کس ارادہ سے اس مقدمہ میں ہم نے گفتگو کی ہے۔ اب اس معاملے کو ختم کئے بغیر دو تین دن اور ہاتھ نہیں کھینچنا چاہئیے اور چار و ناچار مکرر بات کو دیکھنا چاہئیے۔ شاید دنیا کی اصلاح اس صورت سے ہو جائے۔ اگر نواب کی آزردگی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ تمہارا روزمرہ بھی بند بند کردے تو پھر تمہارا اس جگہ رہنا عبادت ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو القُوَّۃِ المَتِیْنُ (کیونکہ اللہ رزق دینے والا اور قوت والا ہے) حوصلہ کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ نادانوں کی معمولی سی بات پر اپنی جگہ سے نہیں جانا چاہئیے۔ انشاأ اللہ سچائی غالب آئے گی۔ سب بھائیوں کے ساتھ حزب البحر کا وظیفہ پڑھتے رہو۔ مولوی صاحب کے متوسلین فقیر سے احتراز کرتے ہیں۔ اس کی وجہ معلوم نہیں۔ اور انھوں نے برسوں سے ملاقات کرنا بند کر دیا ہے۔ ہمیشہ ان کی طرف سے سلامِ اشتیاق اور ملاقات ہوتی تھی۔ اس

روپیہ کا راز میں نہیں سمجھا۔ وہ جھوٹا فقیر جس دن سے میرے گھر سے دواتے معہود لے گیا ہے اپنی صورت چھپائے ہوئے ہے اور خدا اس کی شکل نہ دکھلائے۔ اس لئے فلاکت اور افلاس میں گرفتار ہے۔

والسّلام۔

بنام صاحبزادہ غلام عسکری خان محمدی

(۶۹)

تمہارے خط سے جو احوال نگاہداشت اور تنخواہوں میں تخفیف کے حال پر مشتمل تھا ،ور دوسری معتبر خبروں سے مطلقاً بے اصولی کا حال معلوم ہوا، عجیب بات ہے. طاقتور دشمن کا مقابلہ درپیش ہے ۔ حصول مقصد کے ساتھ جان اور آبرو کی حفاظت بھی منظور ہے ۔ ایسے وقت میں روپیہ پیسہ خرچ کئے بغیر نئے رفیقوں سے جانفشانی کی توقع کرنا عقل سے دور بات ہے ۔ اگر خزانے میں روپیہ زیادہ نہ ہو تو مقدور بھر اور ضرورت کے مطابق لوگوں کو روپیہ دینا چاہیے ۔کیوں کہ نواب کی رفاقت آخرت کے لئے تو ہے نہیں ۔ لوگوں کے فائدے کے خیال سے ہٹ کر اپنے مصائب دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے ۔ یہ مخالف اسی لئے لوگوں کے ساتھ رعایت کرتے ہیں ۔ منت اور سماجت کے ساتھ انھیں اپنا دوست بناتے ہیں ۔ اور جو عزیز فقیر کے کہنے پر اس فتوح کو چھوڑ کر بے سامانی کے ساتھ سفر کی تکلیفیں اٹھائیں اور جنہیں آدھی روٹی اور تھوڑا سا پانی بھی نہ ملے تو پھر وہ میری تعریفیں تو کرنے سے رہے ۔ اگر میرے پاس پیسہ ہوتا تو ان مایوس سرداروں پر خرچ کرتا اور انھیں بھیج دیتا کیونکہ ہر قوم کے سردار ہم سے ربط رکھتے ہیں. کیا کروں ؎

بے زری کرد آنچہ دشمن بقاروں زر کرد'

ارشاد خاں اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اور بختاور خاں اپنی بہادری کے ساتھ، ایک اور شخص ہے محمد خاں آفریدی جو معمولی کوششوں سے روہیلہ سرداروں کو اپنی

طرف کھینچ لیتا ہے ۔ اور ان کے ہنگاموں کو برہم کر دیتا ہے۔ یہ سب لوگ پے بہ پے فاقے کر رہے ہیں۔ ان میں سفر کی طاقت کہاں ہے۔ جب تک ان کی مدد نہ کی جائے اور روزمرہ کی وصولیابی سے متعلق پکا وعدہ نہ کیا جائے یہ کام مشکل ہے۔ اپنے اقارب کے بارے میں کیا لکھوں کہ ان کو اس گہرے رشتے کے باوجود ان کے (نواب) دولت خانہ سے کوئی فیض نہیں پہنچا (سب) گھر پڑے ہیں۔ اپنی طرف سے ہم نے نواب کو خط نہیں لکھا اور نہ روئے سخن نواب کی طرف ہے۔ سعادت خاں کو شاہ ولی خاں زبردستی اپنے ساتھ لے گیا اور سعادت خاں ابھی تک واپس نہیں آئے تاکہ ان کے ناکردہ گناہوں کی خوشخبری ملتی۔

والسلام۔

بنام صاحبزادہ غلام عسکری خان محمّدی

(۷۰)

یہاں نواب[1] اور جاٹ[2] کی نجیب[3] خاں سے صلح کا شور مچا ہوا ہے۔ اور دونوں طرف کے معتبر رازداروں سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی مصلحت کی وجہ سے جاٹ راجہ بہادر سنگھ اور دلیر سنگھ کے توسط سے روہیلوں سے دوستی کرتا ہے اور نواب کا ذکر تو صرف برائے نام ہے۔ کیونکہ اس نے (نواب نے) خواہ واقعی بے سروسامانی کی وجہ سے اور خواہ کفایت شعاری کی وجہ سے لوگوں کو خود سے جدا کر دیا ہے اور نظروں میں ذلیل ہو گیا ہے۔ بدمعاملگی کی وجہ سے کسی کو نواب پر اعتماد نہیں رہا۔ اور دوسرے یہ کہ لوگ کیوں نواب کی طرف آئیں۔ وہ اپنے اغراض کو مقدم رکھتا ہے۔ آج کل کسی پر اعتماد نہیں ہے کہ عزیزوں کے خلاف کچھ لکھوں۔ اتنا بھی پریشان ہو کر لکھا ہے۔ شہر کے حال سے لے کر محل کی خبروں تک فقیر سے کچھ نہیں چھپا۔ اور جو کچھ حقیقت ہے فقیر تک پہنچ جاتی ہے۔ ہر چند میں نے کئی بار اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نواب جو کچھ کرنا چاہے مجھے بتا دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ورنہ میں ایسی بنیاد رکھتا کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے۔ مشکل یہ ہے کہ نواب کے تمام مشورہ دینے والے لالچی اور خود غرض ہیں۔ اکثر پنچ قوم سے ہیں۔ اور جو شریفوں میں سے ہیں وہ منافق ہیں۔ اس تمام جھگڑے کی جڑ آقا کی بے اعتمادی ہے۔ کیونکہ نہ تو اس کی نیکی سے یقین کی حد تک امید ہے اور نہ اس کے شر سے کوئی خوف۔ ہم

ظلم کی کہاں فریاد کریں۔ چونکہ تم آشنا اور آشنازادے ہو اس لئے یہ دل سوزی کی ورنہ مجھے دنیا اور اہل دنیا سے کیا کام۔ شہر کے درویش بھی نواب سے خوش نہیں ہیں۔ نواب نے جن کو بہت مال و دولت دی ہے وہ مخالفوں سے ملکر نواب کے دشمن ہو گئے ہیں اور جن درویشوں کو اس سے فائدہ نہیں پہنچا وہ کیوں خواہ مخواہ دل کو جلائیں اور کیوں اضطراب قلبی سے توجہ اور دعا کریں کہ قبول ہو۔ نواب ہر کافر اور مومن فقیر رجوع کرتا ہے۔ اور خود کو ایک یا دو کے دامن سے نہیں باندھتا کہ پھر بات اس فقیر کے ذمہ پڑے۔ لوگ اس کے عہد میں پریشانیاں اٹھاتے ہیں۔ دیکھیے کیا ہو خدا انصاف کرے۔ ظالموں پر قہر اور مظلوموں پر رحم کرے۔

والسلام۔

بنام صاحبزادہ غلام عسکری خان محمدیؒ

۱۷

شاہ ابدالی نے پشاور میں قیام کیا ہے اور اپنے بڑے لڑکے تیمور مرزا کو بہت بڑی فوج کے ساتھ ممالک خراسان کے بندوبست کو رخصت کیا ہے۔ پنجاب اور ملتان دونوں ممالک میں آج کل نظم و نسق نہیں ہے (ابدالی) کو ان کی اصلاح کا خیال ہے۔ اور امکان غالب یہ ہے کہ اس کام کو اپنی فوجوں کے ذریعہ کرے۔ اور اگر اس کی ضرورت پڑی کہ خود سفر کرے تو وہ لاہور اور ملتان تک پہنچ جائے گا۔ آخر اس کا ملک ہے۔ وہ ہندوستان آنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس نے جدید فوج فراہم نہیں کی ہے۔ صرف قدیم فوج ساتھ ہے۔ اہل دلی فرار کے عادی ہیں۔ بے اختیار ہو کر گھبرا جاتے ہیں۔ اور یہاں مزاحمت بہت ہے۔ یہی مناسب ہے کہ یہ فتنہ لاہور سے دلی کا قصد نہ کرے۔ ہماری اور تمہاری آبرو ایک ہی ہے۔ کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ ہم نے اس آیت پر عمل کیا ہے۔ فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ (اللہ کی طرف بھاگو) فی الحال متعلقین کو بھرت پور لے جانا اچھا ہے۔ لیکن آیندہ کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ آخر میں یہ فتنہ اس علاقہ میں جاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مجھ کورسواد فقیر کو معتبر معتمدوں سے یہی معلوم ہوا ہے۔ ہم نواب کو خوب جانتے ہیں۔ پھر اس صورت میں شکر و شکایت کیا۔ لوگ اپنی عقل کے مطابق بات سمجھتے ہیں۔ کوئی ہمارے آثار دیکھ کر اندازہ لگاتا ہے کہ ہم نواب سے خوش ہیں یا ور

کوئی بعض حالات سے گمان کرتا ہے کہ ہم ناراض ہیں۔ حقیقت سے دونوں ہی غافل ہیں۔ فقیر تو آئینہ کی طرح ہے۔ جب نواب کسی بھی نیت سے اس طرف ملتفت ہوتا ہے اس کا عکس اس آئینہ میں منعکس ہو جاتا ہے۔ اور جب کبھی وہ منہ چھپاتا ہے خواہ کسی ضرورت اور عذر کی وجہ سے کیوں نہ ہو تو پھر اس آئینہ میں کوئی صورت نظر نہیں آتی اور لوگ تو گفتگو میں معذور ہیں۔ آپ اس میزان کو یاد رکھیے انشاءاللہ اس کے بعد ہماری ہر حرکت اسی میزان کے مطابق پائیں گے۔ اگر نواب ہمارا سلیقہ چاہتا ہے اور ہماری سلامتِ عقل پر بھروسہ کرتا ہے اور اچھی اور بری باتوں میں ہم سے صلاح لیتا ہے۔ تو خلق اللہ کے لئے قوی توجہ اور مفید تدبیر کو ہم کام میں لائیں گے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہاں عقلمندوں اور شریف لوگوں کی بات کا گزر نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ جو ہماری شان کے شایاں نہیں تھا وہ ہم نے نہیں کیا یعنی امورِ ملکی اور مالی پر توجہ نہیں کی۔ اتنا بھی اعزہ کی خاطر ہم نے ان کلمات سے اپنی زبان کو آلودہ کیا ہے، جس سے شرمندہ ہیں۔ والسّلام۔

بنام صاحبزادہ محمدؒ احسان محمدیؒ

(۲۷)

جو کچھ احوال و شہود کے بارے میں تم نے لکھا ہے کہ ہر ذرّہ میں ذاتِ خداوندی کا ظہور معلوم ہوتا ہے اور اسے تم نے توحید متعارف سمجھ لیا، یہ غلط ہے۔ جو توحید وحدتِ وجود ماننے والے لوگوں کے سامنے ہے وہ مرتبۂ صفات سے بالا نہیں ہے چاہے تم اسے بزعم خود توحیدِ ذات سمجھو اور چاہے کثرت میں ایک ہی وحدت کے ظہور سے انکار کرو۔ چنانچہ ہمارے پیر حضرت مجددؒ الف ثانی نے ایک خط میں لکھا تھا کہ صوفی کمالات نبوت سے بہرہ رکھتا ہے۔ تجلی ذات بغیر صفات کی آمیزش سے مشرف ہوتا ہے۔ اگر اس کو شہودِ توحید میسر ہو تو وہ دوسرا عالم ہے، خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے ہمارے اور تمہارے ایسے ناکارہ لوگوں کو اس دولت سے مشرف کیا۔ لیکن اس سے بھی اصل چیز اپنی بندگی اور خدا کی معبودیت کا مشہود ہے جو شریعتِ ظاہری کے مطابق ہے اور انبیاءؑ علیہم السلام کے مناسب ہے۔

والسّلام۔

بنام صاحبزادہ محمد احسان محمدی

(۷۳)

حافظ سرور خاں کو طریقہ میں داخل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ تمہارا ہاتھ فقیر کا ہاتھ ہے۔ اور انھوں نے کسبِ طریقہ اور فقیروں کی صحبت میں رہنے کا ارادہ کیا ہے۔ خدا انھیں میسّر کرے۔ فقیر کا دل بھی اس عزیز کی طرف بہت کھنچتا ہے ظاہرا اچھی قسمت رکھتا ہے۔ اگرچہ تمہاری صحبت کا فیض ہی کافی ہے۔ جو کچھ تم نے اس عزیز کو سرکار احمد خاں کی قید سے آزاد کرانے کے لئے التماس کیا تھا اس سلسلے میں کئی بار دعا اور توجہ کا قصد کیا۔ ہر دفعہ یہ معلوم ہوا کہ جس کی قید میں وہ ہے اس کے حق میں اس کا محبوس ہونا مقدر ہو چکا ہے۔ دعا نہیں کرنی چاہیئے پتہ نہیں اس میں کیا حکمت ہے آخر میں ظاہر ہو جائے گا۔ اس عزیز کو اطمینان دلا دینا چاہیے ؎

بعدِ نومیدی بسے امید ہاست
دربس ظلمت بسے خورشید ہاست

فقیر کی دعا خانہ آباد پہنچا دیجئے۔ آپ کے اہلِ خانہ کا حال تبانا آپ کو پریشان کرنا ہے۔ اور اعزّہ واقربا کے حالات سے بے خبر رہنا گناہ ہے۔ غلام عسکری خاں کی والدہ وغیرہ فاقہ کشی کی وجہ سے فرخ آباد جانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ خدا لحفظ وامان سے پہنچا دے۔ اور (یہ سفر) راست آئے گا کیونکہ ہر ایک کا رزق اس کے ساتھ ہوتا ہے۔

والسّلام۔

بنام صاحبزادہ محمدؐ احسان محمدی

(۴۷)

آپ بیوی بچوں کا غم نہ کیجئے خدا رزاق ہے۔ اخذِ طریقہ کے لئے روہیلوں کا اتنا ہجوم ہے کہ تمام دن توجہ دینے سے فرصت نہیں ملتی۔ طاقت ختم ہو گئی ہے لیکن میں اسے سعادت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر عبادت نہیں ہے۔ اس قوم میں عجیب وغریب آثار ظاہر ہوتے۔ ہم نے یہ سفر بالکل ٹھیک کیا۔ فقیر کے پہنچنے کی خبر سن کر یہ لوگ دور دراز علاقوں سے احرام بستہ آتے ہیں۔ یہ لوگ آدمیت عرضی سے کم واقف ہیں اور ان کے علماء کا علم بھی فقہ کی دو کتابوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

پھر بھی یہ سفر اس علاقہ کے لوگوں کے لئے مفید ہوا۔ سنبھل، امروہہ سے لے کر شاہجہان پور تک تمام منزلوں میں ٹولی ٹولی بنا کر ایک ایک گروہ نے قوم روہیلہ میں سے اکثر اور ہندوستانی لوگوں میں سے کمتر نے اخذِ طریقہ کیا ہے اور منور و متاثر ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جماعت ساتھ آتی ہے اور کسبِ مقامات کے لئے میرے ساتھ دلی جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس علاقہ کے اکثر علماء اس طریقہ کی نسبت سے مشرف ہوئے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے جو دہلی جانے کی سکت نہیں رکھتے میں نے اس شہر میں میر مبین خاں کو اپنی جگہ چھوڑ دیا ہے۔ یہ اصلاحی مقامات سے گزر چکے ہیں اور اجازتِ مطلقہ پا چکے ہیں۔ اور ان کی توجہ بھی بہت مؤثر ہے۔ ان دنوں اتفاقاً اپنے شہر سے مجھ سے ملنے آئے تھے۔ لوگ اس بزرگ زادے کی صحبت سے بہت فیض

اٹھاتے ہیں ۔ اور بہت لوگ رجوع کرتے ہیں ۔لیکن ایک آدمی کے بس کا کام نہیں کہ اس قافلے سے عہدہ برآ ہو سکے ۔ میرا خیال ہے تم کو بلالوں ۔ بعض شہر تم کو اور میر مبین خاں کو تفویض کر دوں ۔ ہم میں طاقت نہیں رہی ۔ بے طاقتی کے باوجود ہر روز بے شمار توجہ دی جاتی ہے ۔ زہے سعادت! حافظ سرور خاں کو خدا توفیق دے کہ کچھ روز ہمارے ساتھ رہے ۔ اس کی محبت نے ہم پر بہت حقوق ثابت کر دیے ہیں ۔ وہ اس کا پھل اور نتیجہ بھی اٹھائے ۔

والسلام ۔

بنام قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱)

۷۵

حمد اور صلوٰۃ کے بعد فقیر جانجاناں کی طرف سے جناب فضیلت و ولایت مآب دلوی صاحب سلمہ الرحمٰن صاحب مطالعہ کریں خدا آپ جیسے شریعت کو رواج دینے والے، طریقت کو منوّر کرنے والے اور دین اور دیانت کے نورِ مجسّم کو سلامت رکھے کثّر اللہ امثالکم و یسّر امالکم (اللہ آپ کی مثال کو ہمارے ہاں زیادہ کرے اور آپ کے انجام کو آسان کرے) آپ کا اچھا بُرا بعینہٖ فقیر کا اچھا بُرا ہے۔ فقیر کا اعتقاد ہے کہ تمام موجودات میں آپ کا وجود عزیز ترین ہے اور بہت سے انوار و برکات کا مصدر ہے۔ مردوں میں تم سے زیادہ عزیز اور عورتوں میں بہو جیو یعنی تمہاری بیوی سے زیادہ ہمارا کوئی مخلص نہیں ہے۔ فقیر ی کے اس آخری زمانے میں ہمارا تجرد اتنا بڑھ گیا ہے کہ کسی کی صحبت اچھی نہیں لگتی۔ (تم لوگ) مل گئے ہو۔ جتنی توجہ دیتا ہوں یاران حلقہ کے ساتھ بس اتنی دیر بیٹھتا ہوں۔ اہل دنیا سے کوئی توقع نہیں ہے۔ خالی زبانی جمع خرچ کرتے ہیں۔ اور اگر وعدہ پورا کر دیتے ہیں تو گردن پر احسان کا بہت بڑا بوجھ رکھ دیتے ہیں اور لڑتے ہیں۔ میں دیوانہ آدمی ان مکروہات کی تاب نہیں رکھتا۔ دوستِ دل نواز کی خبرِ جانگداز نے جو دل کو صدمہ پہنچایا ہے وہ کسی کو نصیب نہ ہو۔ اس کی سعادت کی علامت اس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ اس کے امورِ آخرت تم جیسے صاحبِ کمال نے انجام دیئے۔ برخوردار احمد اللہ کی بیماری کی خبر سے سخت تشویش ہوئی۔ میری

عمر طبعی آخر ہو چکی ہے ورنہ میں خود اپنی زندگی اس برخوردار کو بخش دیتا۔ کیونکہ یہ نسخۂ انسانیت بڑی محنت سے درست ہوا تھا۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔ پیر علی کی قسمت میں دنیا نہیں ہے حالانکہ لاکھ ہاتھ پیر مارتا ہے۔ علی رضا خاں نے فقیر سے طریقہ حاصل کیا ہے اور لطائف خمسہ کا ذکر جاری ہو گیا ہے۔ اور انھوں نے نفی و اثبات شروع کر دیا ہے۔ آپ کی خدمت میں پہنچتے ہیں اور آپ کے حلقہ میں شامل ہوں گے۔ ان کے لطیفۂ قلب پر توجہ ضروری ہے۔ پہلے یہی لطیفہ منظور ہے۔ پریشانیاں اور فتوحات ظاہری کا انسداد تحریر میں نہیں آتا۔ اور شکر باطنی بھی نہیں کیا جاتا۔ ع

"ہر چہ بشود یار سلامت ماند"

یاران حلقہ مقصد کی طرف متوجہ ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔ اور مخصوصانِ غائب فیوض و برکات کے حاصل کرنے میں حکمِ حاضراں رکھتے ہیں۔

والسلام۔

بنام قاضی ثناءاللہ پانی پتی

۷۶

فقیر تمہارے انداز تحریر سے ناراض تھا۔ چونکہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لئے میں نے خود کو زبردستی باز رکھا۔ اور تمہارے حق میں دعائے خیر کی تاکہ خاطر جمع ہو۔ اب جو تم نے معذرت کی ہے دل صاف تر ہو گیا۔ ہم نے معاف کر دیا۔ خاطر جمع رکھو۔ ہمارے آپس کے تعلق کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر کوئی نامعقول بات بھی کہی جائے تو حسنِ ظن کی وجہ سے جو اس نسبت کے لئے لازم ہے تسلیم کر لی جائے کجا کہ بحث کی جائے۔ حرفِ معقول کے مقابلے میں ہمیں تمہارے کمالات اور حقوقِ اخلاص منظور ہیں۔ خیر خواہی اور تمہاری تربیت کے خیال سے افسوس کا اظہار کیا تھا۔ خدا اس کا فائدہ پہنچائے۔ لطف النساء کے انتقال کی خبر نے پتّہ پانی کر دیا اور دل کو کباب بنا دیا۔ خدا اس مرحومہ کو بخشے۔ (ہم نے) برزخ میں توجہ کی خدا کا شکر ہے کہ اس پر خدا کا فضل اور مہربانی ہے۔ برخوردار احمد اللہ سے خوف ہے کہ بہت صدمہ اٹھاتا ہو گا۔ انشاء اللہ بہت جلد تسلی ہو گی۔ نسبت طریقہ اور اطمینانِ نفس بھی آخر اپنا کام کرے گا۔ خاطر جمع رکھو۔ اخوان اور اخوانِ پانی پت کی خدمت میں سلام پہنچا دینا۔ والسلام۔

بنام قاضی ثناء اللہ پانی پتی

(۷۷)

میرے بھائی عجیب بات ہے پانی پت کا ہر شخص تمہاری شکایتوں سے بھرا ہوا آتا ہے۔ معلوم نہیں تم کیا کرتے ہو۔ اگر تمہاری سچائی اور دیانت لوگوں کی تکلیف کا سبب ہے تو ایسی راستی سے باز آؤ۔ لوگوں کی دلجوئی اور حفظِ حرمت کے لئے تاویل سے کام لیا کرو کیونکہ (تمہارے عمل سے) طریقہ اور پیرانِ طریقہ بدنام ہوتے ہیں۔ ان کمالاتِ ظاہری اور باطنی کے باوجود دشیموں کی خاطر دوسروں کو آزردہ کرنا اور خود کو بدنام کرنا عقل سے دور بات ہے۔ لوگوں کی ناراضگی رشد و ہدایت کے سلسلے کو نقصان پہنچاتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں بادشاہ سے کوئی توقع نہیں ہے کیونکہ جیسا مزاج ہم رکھتے ہیں اس کے ہوتے ہوئے کیسے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ گلاوٹی سے خط آیا ہے کہ سید نعیم اللہ انتقال کرنے والے ہیں۔ (ان کی) زندگی کی کوئی توقع باقی نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ میری موت کہاں طوق و زنجیر میں گرفتار ہے جو (مجھ تک) نہیں پہنچتی اور دوست ہیں کہ چلے جاتے ہیں۔ فقیر اس بے حقیقت اور ہیچ کارہ یعنی دلیل اللہ کو بہت دوست رکھتا ہے۔ اس کی محبت کا عکس فقیر کے آئینۂ دل میں پڑا ہے ورنہ باطن میں ہرگز صفحۂ کائنات کا کوئی نقش نہیں۔

ان صاحبوں کے خاندان اور اس فقیر کی دوستی مشہور رہی ہے۔ لیکن اخلاص اور محبت کا وہ جیسا اہتمام کرتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ ہمارے

خطوط کا جواب نہیں دیتے اگرچہ کثرتِ اشغال عذر ہو گا لیکن مجھ دیوانے کو اس بے اہتمامی کی تاب نہیں۔ انصاف کی رو سے جوابِ سفارش کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے کہ ان خطوط کا جواب تو عمل کرنا ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس قاعدہ میں ہم سے کوئی تقصیر نہیں ہوئی۔ اس تمہید سے مراد یہ ہے کہ میاں فضل علی یارانِ طریقہ میں اور میاں شرف الدین آشنا اور آشنا زادے ہیں۔ انھوں نے فقیر سے کلمۃ الخیر کی درخواست کی تھی۔ (غالباً کسی سے سفارش کرائی تھی) چونکہ آئینِ آدمیت میں انکار کرنا کفر ہے مجبوراً خط لکھا شاید (اس کا) اثر ہو اور ان کا کام ہو جائے۔ یہی مقصودِ فقیر ہے۔ والسلام۔

بنام قاضی ثناءاللہ پانی پتی

(۷۸)

مردم محل کو ان کی درخواست کے مطابق پانی پت رخصت کرنا قرار پایا ہے تمہیں چاہیے کہ جب وہ پہنچیں تو ان کی دلجوئی اور خاطرداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اور وعظ و نصیحت میں ان پر سختی مت کرنا۔ اور بہت دلجوئی کرنا۔ اگر فقیر کو پیٹھ پیچھے برا کہیں تو ہرگز مقابلہ نہ کرنا اور ہرگز بد دل نہ ہونا کیونکہ ہماری تمہاری خیریت اسی میں ہے۔ لیکن جب بات حد سے گزر جائے تو پیر علی کے مشورے سے جو مناسب ہو کرنا کیونکہ وہ ان کا ایک حصہ ہونے کے باوجود فقیر کا طرفدار ہے اور ان کا مزاج داں بھی ہے۔ اگر وہ کسی کے گھر جائیں تو انھیں ہرگز وہاں نہ چھوڑنا۔ مباحہ کاموں کے لئے انھیں ڈھیل دیتے رہنا۔ ایسا نہ ہو سودا کی زیادتی سے فتنہ پیدا ہو جائے۔ پیر علی شور سودائے موروثی رکھتا ہے۔ اس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ چاہو تو نہ دکھانا کہیں اپنی والدہ کے پاگل پن سے تنگ آ کر دور نہ چلا جائے۔ دعا کرو کہ ان سودائیوں کے مزاج ٹھیک ہو جائیں۔ فقیر کو پانی پت میں تمہارے بھائی کی خباثت اور نفاق سے پریشانی ہے۔ تمہارے خاندان سے مجھے بے انتہا محبت ہے۔ ان مکروہات کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے، اسی واسطے اس طرف کا ارادہ کرنے میں متردد ہوں۔ تمہیں کسی کو چھوڑنا نہیں چاہیئے کہ وہ الگ ہو جائے کیونکہ ظاہر اور باطن میں دنیا تمہارے دامن سے آویختہ ہے۔ بیوی دعا کہتی ہیں۔ تم سے بہت خوش ہیں۔ زہے اقبال و طالع! والسلام۔

بنام قاضی ثناءاللہ پانی پتیؒ

(۷۹)

نفسِ قدسی ۔ شخص علوی اس ہیچ کارہ اور ہیچمداں کے مہربان اور قدر دان فریدالدین خاں صاحب اپنے کمالات سے قطع نظر آپ کے کمالات کی بہت زیادہ قدر کرتے ہیں ۔ آپ کی تالیفات میں سے مسائلِ طریقہ پر ایک کتاب ان کے پاس تھی نقل کرنے کے لئے لے لی اور دوسرا نسخہ جو تم نے اسی سلسلے میں میاں مُنیر صاحب کی صاحبزادی کے لئے تالیف کیا تھا سنبھل کے اس سفر میں نظر سے گزرا ۔ مبتدیوں کے لئے بہت فائدہ مند ہے ۔ وہاں نقل کرنے کی فرصت نہ ملی ۔ اگر اس کا نسخہ آپ کے پاس ہے تو ارسال کر دیجئے تاکہ میں نقل کر لوں ۔ رسالہ تصوف کا مسودہ مولوی غلام علی کی معرفت ملا ۔ ہم ان مطالب اور مسائل کے مطالعہ سے مشرف ہوئے اور اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں اور بڑے عطیوں میں شمار کیا ۔ تحقیق کے بعد توضیح کہاں ملتی ہے ۔ میں نے بہت لطف اٹھایا ۔ اللہ تمہارے درجات اور بڑے بڑھا ۔ آپ کو چاہیئے کہ اپنے تصنیف کیے ہوئے چھوٹے بڑے تمام رسائل ایک جلد میں جمع کریں ۔ غفلت نہ کیجئے ۔ آپ نے سیرِ نبوی کی جو چار جلدیں مانگی تھیں ان میں سے تین جلدیں محمد عظیم کے حوالے کر دی ہیں اور تیسری جلد کو چند روز کے لئے عاریتاً اپنے پاس رکھ لیا ہے ۔ آج کل دل و دماغ پر اتباع سنت کا خیال بہت چھایا ہوا ہے اور اعمال کو سُنت کی میزان پر پرکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے

ملاقات کے وقت یہ کتاب حوالے کر دی جائے گی۔ بشرطیکہ تم بعض امورات کو فارسی میں لکھ کر مجھے دے دو۔ کیونکہ اتباعِ سنّت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اگر خلاصۃ السیر کی شرح کو مکمل کرنے کا ارادہ ہے تو اپنے فضل و علم کے مطابق پوری کوشش کو کام میں لانا چاہیئے تاکہ جو مطالب پہلی جلد میں پھیلائے تھے وہ سمیٹ لئے جائیں۔ شرح "سفر السعادت" کا نسخہ موجود ہے لیکن ہمارے اور تمہارے درمیان اس کا وعدہ نہیں تھا۔ جب بھی تم طلب کرتے تم سے بڑھ کر کون اس کا مستحق تھا۔ یہ نسخہ بھی محمد عظیم کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ نسخہ خود مصنف پڑھ چکا ہے اور مصنف کے ہاتھ سے اس پر حواشی بھی لکھے ہوتے ہیں۔ میں شیخ عبد الحق کا خط پہچانتا ہوں۔ ان کی قدر جانو۔ بہت ہی احتیاط سے اسے رکھنا جیساکہ کرتے ہو۔ ہر چند مولوی نعیم اللہ کی رخصت قریب ہے سیف المسلول کا نسخہ ان کے حوالے کر دیا ہے۔ خلاصۃ السیر مع ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب کہ دونوں فقیر کے پاس تھے بھیج دیئے ہیں۔ خدا پہنچا دے۔ والسلام۔

۷

بنام قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ

برخوردار احمد اللہ اور محمد جمیل پہنچ گئے۔ گرمی کی وجہ سے انھوں نے چند مقام کیے تھے۔ بارش پڑنے کے بعد ۲۴ محرم کو مردم محل کی رخصت قرار پائی۔ اسی ماہ کی ۲۳ تاریخ یعنی یکشنبہ کی شام کو سواری، باربرداری معہ ساتھ کے لوگ دروازے پر آگئے (اسی وقت) پیر علی کے گھر میں ولادت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور تدبیر کا ورق الٹ گیا۔ روانگی موقوف ہو گئی۔ صبح یعنی دوشنبہ کو احمد اللہ کو ہم نے رخصت کیا۔ جب احمد گنج پہنچا تو تقریباً بیس سوار روہیلہ ادھر سے آرہے تھے۔ ان دونوں نوجوانوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور جب ان دونوں کو جنگ پر آمادہ پایا تو ان کے ہتھیاروں سے ہاتھ اٹھا لیے۔ اور محمد جمیل سے کپڑوں کا بقچہ لے لیا اور بھاگ گئے۔ احمد اللہ ننگ وعار کے خیال سے ان کے پیچھے بھاگا۔ ہر چند محمد جمیل نے روکا مگر فائدہ نہ ہوا جس جگہ پر طویل مسافت کے بعد ان سواروں نے قیام کیا تھا یہ برخوردار وہاں پہنچ گیا اور بقچہ طلب کیا۔ نوبت لڑائی تک آگئی اور احمد اللہ مجروح ہو گیا۔ لیکن خدا نے اس کی جان اور آبرو بچالی اور

سواروں کے دل میں ڈال دی کہ وہ (اِسکی بہادری پر) آفریں کریں، انھوں نے کپڑے آپس میں تقسیم کر لیے تھے۔ انھیں اکٹھا کر کے حوالے کیا اور چلے گئے اور یہ برخوردار شدید گرمی اور زخمی ہونے کے باوجود چھ کروہ کا سفر طے کر کے عصر کے وقت فقیر کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے کاندھے پر تلوار کا ایک زخم آیا تھا۔ سات ٹانکے لگے ہیں۔ بالکل خیریت سے ہے اور فقیر نے اِس برخوردار کے غسلِ صحت تک اپنا سفر ملتوی کر دیا ہے۔

انشاء اللہ ایک ہفتے میں ٹھیک ہو جائے گا، زخم گہرا نہیں ہے۔ خاطر جمع رکھو۔ رستم جیسا کام کیا ہے، ہزار آفریں اور ہزار شکر کہ خدا نے اس کی آبرو اور جان کو سلامت رکھا۔

والسّلام۔

بنام قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح

(۸۱)

اس زمانے کا سانحہ یہ ہے کہ آج جمادی الاولیٰ کی انتیس تاریخ کو زوال کے بعد تمہاری والدہ انتقال فرما گئیں۔ اسی وقت ایک لونڈی آئی اور اس نے خبر دی۔ حکیم شریف خاں صاحب تجہیز و تکفین کے بعد (مرحومہ کو) پانی پت روانہ کریں گے۔ اگر ممکن ہوا تو فقیر بھی نمازِ جنازہ کے لئے جائے گا۔ اور اس وقت جتنے تہلیل اور قرآن کے ختم اور استغفار تھے (یعنی جو میں نے پڑھے تھے) سب ان کو بخش دیئے۔ خدا ان پر رحمت کرے۔ مرحومہ سے بہت معمولی تعلقات کے باوجود جو مجھ پر حالت گزری وہ تحریر میں نہیں آتی۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون، اب تمنا یہ ہے کہ خدا بہو جیو یعنی ان کے متعلقین کو زندہ سلامت رکھے۔ کیونکہ اس خاندان میں ان سے (بہو جیو سے) بزرگ اور کوئی خاتون نہیں ہے۔ فقیر میں بھی کچھ نہیں رہا۔ کل یا پرسوں ہمارے بھی انتقال کی خبر پہنچ جائے گی۔ شیخ علیم الدین خدمت میں حاضر ہوں گے۔ توجہ طریقہ سے انھیں محروم نہ رکھیے انکے قلب میں تنویر حاصل ہوگئی ہے۔ قطع مسافت ابھی شروع نہیں کیا۔ اس کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ اس لئے موردِ رحم ہے۔ مردم محل نے مدت سے دونوں وقت توجہ کا التزام کر رکھا ہے۔ نسبت طریقہ کے غلبہ سے ان کے مزاج میں تبدیلی آگئی ہے۔ دنیا سے انقطاع اور آخرت سے اقبال اور خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی محبت میں نمایاں ترقی معلوم ہوتی ہے ۔ اور صوفیانہ زندگی کو کمال متابعت میں گزارتی ہیں ۔ بظاہر تو غدر و فریب کے آثار نہیں معلوم ہوتے ۔

والسلام ۔

بنام متعلقان قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح

ہم لوگوں کو جو اذیت اور تکلیف پہنچتی ہے وہ ہمارے اعمال کی سزا ہے۔

آنچہ بر تو آید از ظلمات غم
ہم زبیباکی و گستاخی ست ہم

اگر بزرگوں کے ساتھ ادب اور چھوٹوں کے ساتھ پیار اور شفقت سے زندگی گزارو تو کوئی تم سے برائی نہیں کرے گا۔ شوہر کی خدمت اور اطاعت کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ دین اور دنیا کی فلاح اور رضائے خداوندی اسی پر موقوف ہے۔ غضب اور غصہ کو پی جانا چاہیئے۔ واہیات باتوں سے زبان کو روکنا چاہیئے اور نماز میں بھی پابندی کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد کس کی مجال ہے کہ تمہیں تکلیف پہنچائے۔ کون مسلمان ایسا ہوگا کہ کسی مسلمان کو حج کے سفر سے روکے۔ بشرطیکہ حج فرض ہو۔ تم پر فرض نہیں ہے۔ اگر عورتوں کو توفیق ہو اور وہ تم سے توجہ کی خواستگار ہوں تو ضرور توجہ دو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ بزرگان طریقہ سے قوی امید ہے کہ اثر ہوگا۔ ذکر الٰہی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی پابند رہو۔ اچھے اخلاق اور عزیز و اقارب کے حقوق کا خیال رکھو۔ یہ نیک نامی اور دونوں دنیاؤں کی کامیابی کا سبب ہوگا۔

والسلام۔

بنام مولوی احمد اللہؒ

(۸۳)

معلوم ہوا ہے کہ تم نے حج کا ارادہ کیا ہے حج کی فرصت نہ ہونے کے باوجود والدین اور غم و الم میں مبتلا بیوی کی حق تلفی کر کے حج کرنا دین داری ظاہر اور نسبتِ باطن کے خلاف ہے۔ اور ایک مستحب کے لئے اتنے بڑے گناہوں کا ارتکاب تم جیسے با کمال آدمیوں سے بہت بعید ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ مکروہاتِ زمانہ پر صبر کرو۔ اربابِ مقاماتِ عالیہ کی طرح خود کو رضائے الٰہی پر چھوڑ دو۔ یہ خطرہ دل سے نکال دو کہ فقیر کے دل کو بہت صدمہ پہنچے گا۔ ذی حق فقیروں کا آزار کسی کے حق میں اچھا نہیں ہوتا۔ غیر حق کی محبت کے سلسلے میں جو کچھ لکھنا چاہیئے وہ تم نے خود ہی لکھا ہے۔ فقیر کے تحریر کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کی یاد میں مشغول رہنا چاہیئے۔ اجر کے فائدے سے قطع نظر سعادتِ اُخروی اور راحتِ دنیاوی بھی اسی میں ہے۔ پُرسے میں تاخیر اس لئے ہوئی کہ جب حُزن و ملال زیادہ ہوتا ہے تو تعزیت سے غم اور بڑھ جاتا ہے کیونکہ تعزیت میں مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔ ان مرحومہ کے حق میں ہم نے توجہ کی تھی۔ ان پر خدا کا فضل و کرم پایا۔ ہم نے ختم بھی پڑھے ہیں۔ خاطر جمع رکھو اور جتنا بھی ممکن ہو ان کے نام پر تہلیل پڑھا کرو۔ تم نے ترقیاتِ باطن کے شکر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ٹھیک ہے۔ فقیر کو بھی اس

کا علم ہے۔ صبح کے حلقہ میں ہر روز پہلے تمہیں توجہ دی جاتی ہے۔ تمہارا مرتبۂ کمالات مرتبۂ نبوت تک پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے یہ تمہاری استعداد کی خوبی ہے۔ عبادت کے اوقات کی تقسیم اور دوستوں کو توجہ دینے کی پابندی کو خود پر لازم کر لو۔ انشاء اللہ فتوحات متواتر میسّر ہوں گی۔ یاد نہ کرنے کی شکایت تو دوستی میں بطور دلگی ہے۔ تمہارا خط ملا جس میں تم نے خط نہ لکھنے کی معذرت کی ہے۔ تقصیر معاف کر دی گئی۔ چونکہ ان لاپرواہیوں سے محبت میں کمی ظاہر ہوئی ہے اس لئے حوصلہ انھیں برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتا اب اس کا خیال رکھنا اور درگاہ سے دونوں جہان کی فتوحات کے امیدوار رہو۔ والسلام۔

بنام مولوی دلیل اللہ رح

(۸۴)

تم نے جو لکھا ہے کہ اس تنگدستی میں تکلیف نہ اٹھائیے (تو اس کا) کیا مطلب ہے۔ معمولی سی تنگی ہو یا فراخیٔ بسیار جو کچھ میسّر ہو گا بھیج دوں گا۔ خدا فقیر کو شرمندگی سے نجات دے۔ کیونکہ تم کو ہم سے شفقت کی توقع ہے اور تم ہم پر اعتماد کرتے ہو اور ہم ناسازیٔ زمانہ سے معذور ہیں۔ اگر فتوح نے ساتھ دیا اور زندگی نے وفا کی تو انشاءاللہ میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک کروں گا کہ تم والدین کی شفقت بھول جاؤ گے۔ تمہیں چاہیئے کہ بزرگانِ طریقہ سے محبت، کتاب کے سبق کی پابندی، والد بزرگوار کی خدمت پر توجہ، والدین اور دادی اماں کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ جب تک تمہارا خط درست نہ ہو جائے کسی معتمد شخص کو مقرر کر لو کہ ہمارے خط لکھ دیا کرے۔ ہر ایک سے گھر کی باتیں کہنی مناسب نہیں ہیں۔

والسّلام۔

بنام محمدؐ مراد

(۸۵)

خدا تم کو ہزاروں سال زندہ رکھے کہ تم میری خاطر میری بیوی کی بدسلوکی برداشت کرتے ہو۔ اور معاملات کو ٹھیک کرتے ہو۔ تمہیں چاہیئے کہ میری بیوی کے نیک و بد سے غافل نہ رہو تاکہ یہاں فقیر خاطر جمعی کے ساتھ طالبانِ خدا کی تربیت میں مشغول رہے۔ تمہیں بھی اس کا اجر ملے گا۔ میری بیوی کی خدمت اور مرزا شاہ علی کی دلجوئی کی کوشش کرتے رہنا۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ تمہاری وجہ سے فقیر کو گھر کی طرف سے سکون مل گیا ہے۔ فقیر اپنی بیوی کی خوشامد کے دھوکے میں آکر سفر حج کے لئے راضی ہوگیا ہے۔ ہندوستان کے دوستوں کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ میں خواہ کہیں ہوں، تمہیں فیض طریقہ بطریقِ قسمت پہنچاؤں گا۔ اگر خدا نے انھیں باز رکھا تو فتوح ہے ورنہ ہرچہ باداباد۔ آخر سفر طاعت ہے۔ بہت زیادہ اکیلے رہنے کی وجہ سے احباب کی جدائی آسان ہوگئی ہے۔ اکثر جانے پہچانے لوگ چلے گئے ہیں۔ پانی پت میں فقیر کے بیمار پڑنے میں خدا کی حکمت تھی کہ وہاں کے لوگوں کی ایک جماعت اور صوفیوں کی ایک جماعت نے دن رات خدمت کی۔ اور مولوی صاحب کا تمام گھر علاج، دوا اور غذا میں مشغول تھا ان لوگوں کا کہاں تک شکر ادا کروں۔ خدا کے فضل سے دوا اور طبیب سب ہی میسّر ہوگئے۔ عمر باقی تھی ورنہ توقع تو تھی نہیں۔ خدا ہماری ملاقات کرائے۔ والسلام۔

بنام حکیم محمد فاروق

(۸۶)

بیماریٔ عام اور ناامنی کی وجہ سے جو شہر کے لوگوں کا حال ہے وہ کہاں تک لکھوں۔ خدا اس شہر سے اپنا غضب اٹھالے کیوں کہ امورِ سلطنت میں کوئی نظم ونسق نہیں رہا۔ خدا خیر کرے۔ مشائخ کی زیارت سے فراغت ہوگئی ہے۔ صبح شام یارانِ حلقہ کی تعلیم، طریقہ اور تربیت میں مشغول ہوں کیوں کہ اس سفر سے یہی مقصد تھا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ تمہیں چاہیئے کہ فقیر کے کہنے کے مطابق ڈیوڑھی پر حاضر ہوا کرو۔ تسکین وتسلّی کیا کرو۔ اور اگر کوئی خدمت فرمائیں جو ضروری ہو تو حقوقِ فرزندی کے پیشِ نظر اسے پہلے انجام دیدینا۔ تم سے اس سے زیادہ امید ہے اور تم برخوردار پر اعتماد کی وجہ سے دل کو سکون ہے۔

والسّلام۔

۸۷

معلوم ہوا ہے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب کی والدہ پادشاہ بیگم کو تجہیز و تکفین کے بعد پانی پت روانہ کر دیا جائے گا۔ اطلاع دینی چاہیئے کہ نماز جنازہ کہاں پڑھی جائے گی۔ اگر جامع مسجد لائیں تو یہ ضعیف بھی ثوابِ نماز میں شریک ہوگا کیونکہ گرمی کی وجہ سے سفر کی طاقت نہیں۔ اور مسجد میں بہت سے لوگ داخلِ حسنہ ہوں گے۔ والسّلام۔

بنام میاں بدر علی صاحب

(۸۸)

حمد و صلوٰۃ کے بعد اس ہیچکارہ و ہیچمدان فقیرِ جانجاناں کی طرف سے وہاں کے صاحبان اور خاص طور پر میاں بدر علی صاحب سلمہ الرحمٰن مطالعہ فرمائیں کہ اُس خط کو مطالعہ کے بعد جس میں مولوی نعیم اللہ صاحب اوصل اللہ الی منتھی مُبْتَغِیَۃٖ (خدا انھیں کمال کی انتہا تک پہنچائے) کو بلانے کی تاکید کی گئی تھی۔ میں نے وطن جانے کی اجازت دے دی ہے۔ خدا ان کے حق میں جو بہتر سمجھے وہ کرے۔ ان کی والدہ ماجدہ کو اس رخصت کی خوشخبری اور سلام پہنچا دیجئے۔

والسّلام۔

بنام غلام عسکری خاں

(۸۹)

باعث تحریر یہ ہے کہ مولوی غلام حسین نام ایک فاضل جو اخوانِ حلقہ اور یارانِ قدیم میں ہیں۔ قصبہ تھانہ کے رہنے والے۔ فاروقی النسب، نجیب اور منجیب نجیب الدولہ کے یہاں بہ عنوانِ فضیلت ملازم ہیں اس سے پہلے اپنی قوم میں (انھوں نے) شادی کی تھی لیکن ان کے ہاں لڑکا نہ ہوا اور بیوی کی موافقت بھی پسند نہیں آئی بلکہ سکونتِ وطن سے بھی خوش نہیں۔ فقیر کی صحبت پسند کی اور دہلی میں مستقل قیام کر لیا۔ اور دوسری شادی کا ارادہ کیا۔ بی بی امتہ المجید کے توسط سے میر فضل علی خاں کی بہن، بی بی فضل النسا تجویز ہوئی ہیں۔ میر فضل علی خاں کو اس امر سے مطلع کر دیا گیا ہے، اب یہ شادی ان کی رضا یا عدم رضا پر منحصر ہے حضرت محمد مبین اپنے والدین کی زیارت کے لئے فرخ آباد جانے والے ہوں گے۔ ان (والدین) کے دم کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور ان کی دلجوئی میں کوئی فروگذاشت نہیں کرنی چاہیے کہ فقیر کی رضا اسی میں ہے۔ وہ (والدین) کسی چیز کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ کے بھائی غلام حسن احمد اللہ کے ساتھ جس آدمیت سے پیش آئے ہیں اسے تحریر کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ کیوں نہ ہو بزرگ زادے ہیں اور بزرگی حاصل کی ہے۔ امینہ کے مکتب کی شادی میرے حضور میں ہوئی۔ والسلام!

بنام میر مسلمان

(۹۰)

باعثِ تحریر یہ ہے کہ میر صاحب مشفق میر شرف الدّین حسین صاحب کہ سید برحق اور اخلاق حمیدہ سے متصف ہیں اور مجھ پر میری مقدور سے زیادہ شفقت فرماتے ہیں۔ اس علاقے کی سیر کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے انھیں آپ جیسے برگزیدہ الفس و آفاق کے (حال سے) مطلع کر دیا ہے۔ وہ آپ کے مشتاق ہیں۔ اگر ملاقات ہو تو آپ سے وہی کچھ ظہور میں آنا چاہیئے جس کی توقع ہے۔

والسّلام

بنام سیّد موسیٰ خاں دھبیدی

۹۱

الحمد للہ علے نوالہٖ والصّلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہٖ وصحبہٖ وآلہٖ بعد حمد وصلوٰۃ، فقیر جانجاناں کی طرف سے حضرت سیّد موسیٰ خاں صاحب ملاحظہ فرمائیں۔ فقیر اس وقت اوائل ماہ صفر ۱۱۸۰ھ میں پانی پت کے اندر عافیت سے ہے۔ محلہ، دہلی کے لوگ بھی بخیر ہیں۔ میری عمر اب اسّی کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بڑھاپے کا ضعف غالب ہے۔ روزانہ چار وقت حلقہ ہوتا ہے۔ صبح، دوپہر، شام اور رات کو لوگ حاضر ہوتے ہیں۔ علماء وسادات سے گروہ گروہ اجازت حاصل کرکے (اپنے اپنے) شہروں کو جانے کی رخصت پاتے ہیں۔ اب میرے ہم عمروں میں کم لوگ باقی رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان کی حالت ابتر ہے۔ ہر طرف فتنہ برپا ہے۔ ارادۂ حج تھا، ناتوانی اور بے سامانی نے اجازت ہی نہ دی۔ اب تو سفر دراز آخرت در پیش ہے حق تعالیٰ بزرگوں کے صدقے میں آسانی سے منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ آپ کے جُدا ہونے کے بعد سے آج تک آپ کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ بعد انتظارِ بسیار حاجی عبد القادر نے جو آپ کے مخلصوں میں سے ہیں آپ کی سلامتی کا پیام پہنچایا۔ جس سے اس مردۂ صد سالہ کے جسم میں جان تازہ آگئی! اور ایّامِ گزشتہ کی صحبتیں یاد آنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر اور ارشاد وتلقین میں برکت عطا فرمائے۔ آپ نے اس علاقے کو منور کر دیا ہے۔ آپ سے

اظہارِ اشتیاقِ ملاقات کروں تو بیکار ہے۔ اسبابِ ظاہری کے پیشِ نظر آپ سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ انشاءاللہ تعالیٰ بشرطِ حسنِ خاتمہ، بہشت جاوداں میں خاطر خواہ ملاقات میسر آئے گی۔ چونکہ بُعدِ مسافت کے باعث بہت کم ہندوستانی آپ کے علاقے میں آتے جاتے ہیں اس لئے ارسالِ خط وکتابت سے بھی قاصر ہوں اور آپ بھی معذور ہیں۔ الحمدللہ دعا سے غافل نہیں ہوں۔ آپ بھی خاتمہ بالخیر کی دعا سے مجھ کو فراموش نہ فرمائیں۔ ہمارے ہم پیروں (پیر بھائیوں) میں سے اس ہندوستان میں سوائے مرزا مظہر کے جو کہ ارشاد وتلقین میں مشغول ہیں اب کوئی زندہ نہیں رہا۔ بلکہ خاندانِ عالیشان میں بھی ایسے صاحبزادگان جو صاحب ارشاد وتاثیر ہوں، نہیں ہیں۔ والسلام۔ (دیگر یہ کہ) اقامتِ دہلی کو ترک کرنے کا سبب یہ ہے کہ طالبانِ خدا شہر میں کم اور قصبات میں زیادہ ہیں۔ تنعّم وتجمل کے اسباب جو سرمایۂ غفلت ہوا کرتے ہیں شہر میں زیادہ اور دیہات وقصبات میں کم ہیں[1] والسلام۔

---

[1] یہ خط مرزا صاحب کے خطوط کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ نسیم احمد فریدی صاحب نے الفرقان (بابتہ جمادی الثانی ۱۳۸۱ھ) میں نقل کیا تھا۔

دیباچہ دیوانِ فارسی

حمد و صلوٰۃ کے بعد فقیر جانجاناں متخلّص بہ مظہر پسر جان جانی تخلص کہ علوی نسب و ہندی مولد و حنفی مذہب اور نقشبندی مشرب ہے۔ اپنے احوال دوستوں کی خدمت میں پہنچاتا ہے۔ سولہ سال کی عمر میں یہ خاکسار یتیم ہوگیا۔ اور بیس سال کی عمر میں درویشوں میں شامل ہوگیا۔ تیس سال تک مدرسہ اور خانقاہ میں جاروب کشی کی' باقی زندگی بھی اسی شغل شریف میں گذار دی۔ اللہ کی دی ہوئی ہمت اور توفیق سے پوری زندگی دستِ طلب کو دنیا کی گندگی سے آلودہ نہیں کیا اور پائے سعی کو اس راہ میں نہ رکھا آج کہ ۱۱۷۰ھ سے اور میری عمر ساٹھ سال ہے بیس سال سے گنج عزلت میں پناہ گزین ہوں اور حضراتِ مشائخ کے احکام کے مطابق انسانوں کے نسخہء وجود کی تصحیح میں مشغول ہوں، جن کی ذات کے فردِ باطل میں ہزاروں غلطیاں ہیں۔ عہد جوانی میں شورِ عشق کی تحریک پر کہ جو جوانی کے خمیر کا نمک ہے، نالہائے موزوں کیے تھے جس لیے شاعری میں میرا نام آگیا۔ والا ہمتی کی وجہ سے اجزائے مسودات

و مواد کلیات اکٹھا نہ کیا۔ بہت سا سرمایۂ سخن برباد ہوگیا۔ باقی میں ارباب نقل و روایت نے نمایاں تصرف کر کے غلط کلام کو رواج دیدیا۔ کور سوادوں نے جن کی آنکھیں نہیں تھیں انصاف سے درگزر کیا۔ شاعری پر اعتراضات کئے اور مغز سخن تک نہ پہنچ پائے۔ ان اعتراضات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوئی۔ اس کم فرصتی کے زمانہ میں جب کہ موت کا خوف بہت زیادہ اور سفر درپیش ہے ان اعتراضات کا جواب میرے اختیار میں نہیں تھا۔ ایک نوجوان سراپا جان نے اس کلام کو ترتیب دینے اور تصحیح کے لئے کہا۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد بیس ہزار اشعار میں سے تقریباً ایک ہزار ملے اور وہ بھی بے ترتیب ردیف اور اکثر غزلیں ناتمام ہاتھ آئیں۔ اس مجموعہ کے علاوہ جو کچھ نظر آئے اسے خارج سمجھا جائے۔ ہاں وہ تازہ کلام جس کے کہنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے اور جو کلام قدیم مسودات میں سے ملے اسے اس میں شامل کر لیا جائے۔ بیس سال پہلے ایک عزیز فقیر کے کچھ اشعار فراہم کر کے میری خدمت میں لایا تھا اور اس پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے چند سطریں لکھ دی تھیں۔ اب اسے معتبر نہ جانیں کیوں کہ وہ تمام اشعار بھی اسی میں شامل ہیں۔ والسّلام علی من اتبع الھدیٰ (سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی)۔

تذکرہ سروِ آزاد میں مرزا صاحب کے حالات

فقیر جانجاناں متخلص بہ مظہر پسر مرزا جان تخلص جانی، علوی نسب، ہندی مولد، حنفی مذہب اور نقشبندی مشرب ہے۔ اس کی ولادت ہوئی۔ ظاہری نشوونما اکبرآباد میں ہوئی اور باطنی تربیت شاہجہان آباد میں حضرت سیّد محمد بدایونی نقشبندی مجددی کے ہاتھوں ہوئی۔ اٹھائیس واسطوں سے محمد بن حنفیہ سے ہوتا ہوا۔ ان کا سلسلۂ نسب شیر بیشۂ کبریا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ پر منتہی ہوتا ہے۔

اس فقیر کے جداعلیٰ امیر کمال الدین نویں ہجری کی ابتدا میں طائف کے علاقے سے نکل کر ترکستان میں آباد ہو گئے اور اس ملک کے بعض فرمانرواؤں کے ساتھ زندگی گزار دی۔ ان کی بہت زیادہ اولاد تھی۔ ان میں سے امیر مجنوں اور امیر بابا اس زمانے میں ہندوستان آئے جب ہمایوں بادشاہ نے ملک فتح کیا۔ اس کے بعد سے سلاطین گورگانیہ کی خدمت اور رفاقت اس خاندان کا شعار رہا ہے۔ میرزا جان مذکور (والد مرزا صاحب) جن کا سلسلۂ نسب چھٹی پشت پر امیر بابا سے اور بارھویں پشت پر امیر کمال الدین سے ملتا ہے۔ عہد اورنگ زیب بادشاہ علیہ الرحمتہ میں منصب عالی ترک کر کے گوشہ گیر

ہو گئے تھے۔ بچپن سے اس خاکسار کو ہوس جاہ و مال نے پریشان نہیں کیا۔ تحصیلِ ضروریات کے بعد اس فقیر نے خود کو فقیروں کے دامن سے وابستہ کر لیا اس امید پر کہ دوسری دنیا پر آنکھ کھل سکے۔ نقشِ قدیم کی طرح ان کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ اس لئے اس کا دماغ ضعفِ قوی رکھتا ہے۔ تدبیر اسباب کی تاب نہیں رہی۔ تجرید و تفرید اختیار کر لی۔ گل کی طرح تمام زندگی ایک ہی لباس میں گزار دی۔ شورِ عشق کی تحریک پر کہ اس کے خمیر کا نمک ہے کبھی فریاد کے لیے لب کھولتا ہے۔ اور چونکہ اس کا نالہ موزوں ہوتا ہے احباب جوہر شناسی کی وجہ سے انھیں اشعار سمجھتے ہیں وگرنہ اپنی بے سرمایگی کے پیشِ نظر غایت انصاف کی وجہ سے اس نے سخن کی دوکان نہیں لگائی[1]

---

[1] آزاد بلگرامی کی فرمائش پر مرزا صاحب نے تذکرۂ سروِ آزاد کے لیے اپنے حالات خود لکھ کر بھیجے تھے۔

دیباچہ بر حاشیۂ رسالۂ مولوی غلام یحییٰ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ، (ہم تعریف کرتے ہیں اللہ کی اور درود بھیجتے ہیں اس کے رسول پر) سرکردہ علمائے فحول اور جامع معقول ومنقول سید غلام یحییٰ اور صلی اللہ الی ماتمنیٰ (اللہ اس کی تمناؤں کو پورا کرے) نسبت اخوت طریقت اس ہیچمدان یعنی جانجاناں سے رکھتے ہیں۔ (انھوں نے) میرے ایما پر مسئلۂ وحدت وجود و وحدت شہود کے بیان میں ایک مختصر رسالہ لکھ کر مجھے دکھایا۔ حق بات یہ ہے کہ اختصار کے باوجود انہوں نے پورے موضوع کا احاطہ کر لیا ہے۔ جزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء (خدا انہیں جزائے خیر دے) لیکن مسئلۂ تطبیق سے الجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مکشوفین کے درمیان تطبیق کا مسئلہ تکلف سے خالی نہیں ہے۔ لیکن اس سے ایک اچھی مصلحت وابستہ ہے۔ ھی اَلْاِصْلَاحُ بَیْنَ الْفِئَتَیْنِ الْعَظِیْمَتَیْنِ (اس سے دونوں عظیم فرقوں کے درمیان مصالحت ہو جائے گی یَرْحَمُ اللّٰہُ عَبْدًا اَنْصَفَ و لم یتعصب (اللہ رحم کرے اس بندے پر جس نے انصاف کیا اور بے انصافی کو روکا) والسلام۔

مرزا صاحب کا وصیّت نامہ

حمد و صلوٰۃ کے بعد فقیر جانجاناں محمدی مجدّدی اس حالت میں کہ جس میں اقرار و منفر صحیح و معتبر ہوتا ہے ان احباب کو چند وصیتیں کرتا ہے جنہوں نے اس سے اخذ طریقہ کیا ہے۔ فقیر کی تجہیز و تکفین کے لیے سنت نبوی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ اس کے بعد میرے مزار پر دکان نہ لگائی جائے کیوں کہ میں زندگی میں بھی اس کا مخالف تھا۔ میں بندگانِ خدا میں سے ایک ہوں اور میں نے خدا کے نام پر تعلیم دی ہے۔ اور بس! چند روز پہلے میری بیوی نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اپنے امور اخروی کی تدبیر ان پر چھوڑ دوں۔
میں نے اس سلسلے میں انہیں ایک تحریر دے دی ہے تاکہ میرے بعد میرے مخلص ان سے مخالفت نہ کریں اور وہ جہاں چاہیں مجھے دفن کریں۔ میں نے اس بات کا زبانی اقرار کر لیا ہے۔ لیکن ان دنوں یہ مستورہ کسی قطعہ زمین کی مالک نہ تھی۔ حال ہی میں انھوں نے ایک حویلی خرید لی ہے۔ میں اس جگہ سے سخت متنفر ہوں

اگر وہ چاہیں کہ مجھے اس جگہ دفن کریں تو دوستی کے تقاضے سے میرے احباب پر واجب ہے کہ ہرگز یہ بات قبول نہ کریں۔ ہاں اس جگہ کے علاوہ جہاں کہیں بھی جگہ میسر ہو ان کی مرضی کا خیال رکھیں۔ بیرون تیر کمان دروازہ مناسب تر جگہ ہے۔ اس مستورہ نے عارضۂ سودا اور طویل عمری کی وجہ سے مجھے پریشان کیا ہے جو دوستوں سے مخفی نہیں ہے۔ لیکن میں نے سب معاف کر دیا ہے اس محبت کے خیال سے جو انہیں خدا اور اس کے رسول سے ہے۔ میرے مخلصوں پر میرے حق وفا کے مطابق ان کی دلجوئی لازم ہے۔ میرے مخلصوں کو یہی وصیت کافی ہے کہ دم آخر تک اتباع سنت میں کوشاں رہیں اور خدا کے سوا کسی کو مقصودِ حقیقی اور آنحضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کو متبوع واجب الاتباع نہ سمجھیں، فقیروں کے طور طریق اپنائیں، اور دنیا داروں سے ملنے ملانے سے گریز کریں۔ علوم دین کے شغل سے خود کو معذور نہ رکھیں۔ اللھم وفقہم لہ[1]

---

[1] مرزا صاحب نے وصیت نامہ لکھ کر اپنے خلیفہ نعیم اللہ بہرائچی کو دے دیا تھا جنہوں نے معمولاتِ مظہریہ میں نقل کیا ہے۔

مکتوب !

(۱) اصل نام مجنوں خاں ہے جیسا کہ مرزا صاحب نے غلام علی آزاد بلگرامی کو ایک خط میں لکھا ہے (سرو آزاد ص ۲۳۲) تذکرۂ سفینۂ خوش گو میں بھی یہ نام مجنوں خاں ہے۔ مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ محبوب خاں اور بابا خاں کا ذکر اکبر نامہ میں موجود ہے (کلمات طیبات ص ۱۴؍۱) لیکن اکبر نامہ میں کسی ایسے قزلباش کا ذکر نہیں ہے جس کا نام محبوب خاں ہو۔ اس کے برعکس مجنوں خاں اور بابا خاں کے نام ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ گھوڑا گھاٹ کی جاگیر ان دونوں کو ایک ساتھ ملی تھی کلمات طیبات مطبوعہ ۱۸۸۵ء ص ۱۸ اور مطبوعہ ۱۸۹۴ء ص ۱۴؍۱، اور معمولات مظہریہ ص ۲؍۱۔ میں کاتب کی غلطی سے نام لکھا گیا۔

جو لوگ ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے ان میں مجنوں خاں کا نام بھی ہے۔ ممکن ہے بابا خاں اس وقت قابل ذکر نہ ہوں یا پھر بعد میں ہندوستان آئے ہوں۔ ہمایوں کی وفات کے وقت مجنوں خاں نارنول کے جاگیر دار تھے۔ ہمایوں کے انتقال کی خبر سن کر حاجی خاں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ دن بعد صلح ہو گئی۔ اور مجنوں خاں دہلی آ گئے۔ اکبر نے مانک پور کی جاگیر بخش دی مجنوں خاں نے بہت سے اہم معرکوں میں حصہ لیا تھا۔ ۹۷۱ھ میں جب جونپور کے صوبہ دار علی قلی خاں نے بغاوت کی تو اکبر خود فوج لے کر گیا۔ مجنوں خاں دائیں بازو کی فوج کے سپہ سالار تھے۔ اس دفعہ شاہی فوج کو فتح ہوئی۔ ۹۷۶ھ میں اکبر نے انہیں کالنجر تسخیر کرنے کے لیے بھیجا تو والیٔ کالنجر راجہ رامچندر نے بغیر جنگ کئے ہتھیار ڈال دیئے۔ ۹۸۹ھ میں

جب شاہی فوج نے بنگال فتح کیا تو گھوڑا گھاٹ کی جاگیر مجنوں خاں اور بابا خاں دونوں کو ملی۔ آئین اکبری میں " بزرگانِ جاوید دولت کے تحت مجنوں خاں کا نام سہ ہزاری منصب داروں میں ہے۔ ۹۸۹ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہوں: مآثر الامراء جلد سوم ص/۲۰۹ و ۲۱۱، اکبر نامہ جلد دوم ص/۲۵۰، تذکرہ ہمایوں و اکبر ص/۳۴۱، آئین اکبری جلد اول ص/۲۲۳ طبقات اکبری (انگریزی) ص/۲۹۶-۳۲۹

THE EMPERER AKBAR -V. I. P. 172

(۲) مرزا صاحب کے والد مرزا جان لڑکے تھے مرزا عبد السبحان کے، وہ لڑکے تھے مرزا احمد امان کے، اور وہ لڑکے تھے شاہ بابا سلطان کے جو بابا خان کے لڑکے تھے۔ مجنوں خاں کے انتقال کے بعد ہند و ستان کے قاقشالان کی سرداری بابا خان کو ملی۔ اگرچہ مجنوں خاں کی وفات کے بعد گھوڑا گھاٹ کی جاگیر کا جائز وارث ان کا لڑکا جبّاری خاں تھا۔ لیکن اکبر نے حکمت عملی سے کام لے کر یہ جاگیر بابا خان کو دے دی۔ ۹۸۹ھ میں بابا خان کا انتقال ہوا تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مآثر الامراء جلد اول ص/۳۹۱-۹۳ تذکرہ ہمایوں و اکبر ص/۲۹۳، ۳۴۱- طبقات اکبری (انگریزی) ص/۵۳۶ خلاصۃ التواریخ ص/۳۸۴۔

(۳) اکبر کے زمانے میں گجرات کے صوبہ دار مظفر خاں نے " آئینِ داغ " نافذ کر دیا تھا۔ آئین کی رو سے تمام جاگیر داروں کو اپنی فوج بھیج کر سوار کا

حلیہ لکھوانا ہوتا تھا اور گھوڑے کے چہرے یا پچھلی ٹانگوں پر ایک داغ لگوانا پڑتا تھا۔ لوگ عام طور پر اس قانون کے خلاف تھے۔ بابا خاں اپنے سوار بھیجتے تو مظفر خاں کے ملازم رشوت طلب کرتے۔ بابا خاں کہا کرتے تھے کہ میں نے نشتر ہزار روپیہ خرچ کر دیا ہے لیکن ابھی تک سو گھوڑے بھی نہیں داغے گئے۔ (مآثر الامرا جلد اول ص ۳۹۱) مظفر خاں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر جب معصوم خاں کابلی نے بغاوت کی تو بابا خاں اور مجنوں خاں کا لڑکا جباری خاں دونوں باغیوں میں شامل ہو گئے۔ مظفر خاں جو ٹانڈہ میں پناہ گزین تھا باغیوں کے ہاتھوں مارا گیا اور باغیوں نے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ فتح کے بعد منصب اور خطاب تقسیم ہوئے۔ بابا خاں نے خانخاناں کا لقب اختیار کیا۔ اس کامیابی کے بعد بابا خاں ایسے بیمار پڑے کہ پھر مر کر ہی اٹھے۔ اکبر نے جب باغیوں پر قابو پا لیا تو مجنوں خاں کے لڑکے جباری خاں کو گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد جباری خاں کے احساس ندامت سے متاثر ہو کر اُسے رہا کر دیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مآثر الامرا جلد اول ص ۳۹۱، اکبر نامہ جلد سوم ص ۶۵، سفینہ خوش گو (قلمی۔ پٹنہ) ورق ۸۷ اب، ۱۸۸، الف۔

اس بغاوت کے بعد اکبر نے اس خاندان پر اعلیٰ مناصب بند کر دیئے۔ خوش گو نے لکھا ہے کہ مجنوں خاں نے اکبر کے عہد میں بغاوت کی تھی۔ اس لیے اس خاندان کے لوگوں کو ملازم نہیں رکھا جاتا تھا۔ لیکن مرزا صاحب کے والد مرزا جان اورنگ زیب کے منصب دار تھے۔ سفینۂ خوش گو (قلمی پٹنہ) ورق ۸۷ اب۔ خوش گو کا بیان درست نہیں۔ مرزا صاحب کے خاندان پر صرف اعلیٰ مناصب بند کیے گئے تھے۔ نیز مرزا جان بھی اورنگ زیب کے منصب داروں میں نہیں تھے کیوں کہ کسی فہرست میں ان کا نام نہیں ہے۔

غالباً وہ کسی معمولی عہدے پر فائز تھے۔

(۴) مرزا صاحب کے والد مرزا جان شاہی ملازمت میں تھے ۱۱۱۱ھ میں وہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن میں تھے۔ ۱۱۱۰ھ میں انھوں نے ملازمت ترک کردی تمام مال واسباب فقیروں میں تقسیم کر دیا۔ اپنی لڑکی کے لئے صرف پچیس ہزار روپیہ بچا کر رکھ لیا۔ ایک دفعہ انھوں نے سنا کہ ایک دوست کو روپوں کی ضرورت ہے۔ انھوں نے وہ روپیے بھی دے دیے ایک مرتبہ انھوں نے گھر میں کدو کا درخت لگایا۔ لونڈی نے کہا: آپ نے یہ درخت تو لگایا ہے ایسا نہ ہو کہ فاقے کے وقت جب گھر میں کچھ نہ ہو تو آپ اس کے برگ و بار کھائیں اور یہ شیوہ توکل و قناعت کے خلاف ہے۔ مرزا جان نے کنیز کی اس بات کو تعلیم الٰہی سمجھ کر درخت جڑ سے اکھاڑ دیا۔ وہ طریقہ قادریہ میں شاہ عبدالرحمٰن قادری سے بیعت تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے مگر تصوف اور شاعری دونوں میں گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ کیوں کہ شعراء اور صوفیاء کے کسی بھی تذکرے میں ان کا ذکر یا کلام نہیں ملتا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں:۔

مقامات مظہری ص/۱۵-۱۶، اور معمولاتِ مظہریہ ص/۱۵۔

(۵) مرزا صاحب کا سنہ ولادت ۱۱۱۰ھ ہے۔ اس پر تفصیلی بحث "مرزا صاحب کے سوانح" کے تحت کی جا چکی ہے۔

(۶) حاجی محمد افضل سیالکوٹی خلیفہ تھے۔ شیخ محمد معصوم بن شیخ احمد مجدد الف ثانی کے۔ انھوں نے بارہ سال تک شیخ عبدالاحد سے تعلیم دینوی حاصل

کی زیارت حرمین شریفین بھی کی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی انہی سے علم حدیث سند کیا تھا۔ وہ کتابوں کے اس قدر شوقین تھے کہ لوگ جو کچھ انہیں بطور ہدیہ پیش کرتے وہ کتابیں خرید لیتے۔ ایک دفعہ کسی نے پندرہ ہزار روپیوں کی پیش کش کی تھی۔ انھوں نے تمام روپیوں کی کتابیں خرید لیں ۱۱۴۶ھ ۳۳ـ۱۷۳۳ء میں انتقال کیا اور خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہوئے۔ ملاحظہ ہوں: خزینۃ الاصفیاء ص/ ۶۶۴، مقامات مظہری ص/ ۹۱-۱۵۰۔

(۷) سید نور محمد بدایونی نقشبندی سلسلے کے ایک برگزیدہ بزرگ تھے۔ وہ شیخ سیف الدین بن محمد معصوم بن مجدد الف ثانی کے خلیفہ تھے۔ حافظ محمد حسن اور محمد بن معصوم کے دوسرے خلفاء سے بھی خرقہ کامل حاصل کیا تھا۔ کثرتِ عبادت سے کمر میں خم آگیا تھا۔ اتباع سنت میں اسقدر محتاط رہتے تھے کہ ایک دفعہ خلاف سنت۔ بجائے بائیں کے دائیں پاؤں بیت الخلاء میں رکھدیا تین دن تک انقباض رہا۔ ۱۱ ذیقعدہ سنہ ۱۱۳۵ھ کو انتقال کیا اور بستی نظام الدین میں مدفون ہوئے۔ ملاحظہ ہوں: معمولات مظہریہ ص/ ۱۵۔ مزارات اولیاء دہلی ص/ ۲۴۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص/ ۷-۹۔

(۸) یہ شیخ عبد الاحد مجددی نقشبندی بن احمد سعید بن مجدد الف ثانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے پیدل تشریف لے گئے تھے۔ ۱۱۶۰ھ میں انتقال کیا۔ مبارک باغ کے سامنے آزادپور دہلی کے قریب مدفون ہوئے۔ مزارات دہلی ص/ ۱۴۴۔ خزینۃ الاصفیاء جلد ۲ ص/ ۶۷۳-۶۷۴

مکتوب ۲۴

(۱) شاہ غلام علی کا بیان ہے کہ میر سلمان دہلی کے سادات میں سے تھے۔ انھوں نے علائق واسباب دنیا سے ترک تعلق کر لیا تھا اور علوم ظاہر و باطن کی تحصیل کے لیے مرزا مظہر کے ساتھ ان کے مشائخ کرام کی صحبت میں رہنے لگے۔ اور پھر خود مرزا صاحب سے استفادہ کیا۔ مرزا مظہر ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ مکتوب ۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر سلمان فرخ آباد چلے گئے تھے۔ اس ترک وطن کا مقصد بظاہر رشد و ہدایت معلوم ہوتا ہے۔ ان کی وفات بھی دہلی سے باہر ہوئی تھی۔ کیوں کہ مرزا مظہر نے میر محمد مبین کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ میر سلمان کی وفات سے جو دل کی حالت ہوئی ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ان کے انتقال کی کیفیت لکھو اور یہ بتاؤ کہ انہیں کہاں مدفون کیا گیا ہے۔ مقامات مظہری ص/ ۶۵ کلمات طیبات ص/ ۵۵، اور ص/ ۷۳۔

(۲) مرزا مظہر نے شیخ احمد کو خادم سرکار میر سلمان لکھا ہے۔ مکتوب ۲۵ سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ احمد بغیر اطلاع کے فرخ آباد سے دہلی مرزا صاحب کے پاس آگئے تھے۔ میر سلمان صاحب شیخ احمد کے اس طرح غایب ہو جانے سے بہت پریشان تھے۔ کلماتِ طیبات ص/ ۵۵-۵۶۔

مکتوب ۲۶

(۱) فیض اللہ خاں امید کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا۔ عبداللہ خاں بھی شاعر تھے اور مشتاق تخلص کرتے تھے۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی گویان

میں ان کے ترجمے میں لکھا ہے کہ عبداللہ خاں ولد ابوالحسن خاں بن سیف اللہ خاں، یوسف زئی پٹھان تھے۔ بقول عبداللہ خاں ان کے والد کا تخلص حسن اور دادا کا سیفی تھا۔ عبداللہ خاں فضل و کمال رکھتے تھے۔ ان کے دادا بہادر شاہ اول کے استاد تھے۔ زرومال کی کثرت ہونے کی وجہ سے ان کے والد نے ترکِ روزگار کرکے خانہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ تذکرۂ ہندی گویاں کی تالیف کے وقت بادشاہ نے انھیں مشتاق علی خاں خطاب دے کر پانصدی منصب پر فائز کیا۔ اور مرزا فرخندہ بخت بہادر کا استاد مقرر کیا۔ بقول مصحفی عبداللہ خاں کو علم جفر و رمل و مہندسی سے بہت دلچسپی تھی اور خط نستعلیق و ثلث و شفیعا کے لکھنے میں وہ یگانۂ روزگار تھے۔ پہلے شاہ محمد علیم حیرت الہ آبادی کے شاگرد تھے اور جب دہلی آئے تو میر تقی میر کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ مصحفی نے ان کے اٹھارہ اشعار کا انتخاب بھی دیا ہے۔ قدرت اللہ شوق نے فیض اللہ خاں کو نبیرۂ نواب بہادر شاہ جہاں پوری بنایا ہے۔ غالباً ابوالحسن خاں کا خطاب نواب بہادر تھا۔ شوق نے لکھا ہے کہ "فیض اللہ خاں صاحبِ مروت، معدنِ حلم و شجاعت، مہذب صورت، پاکیزہ سیرت، معزز و مکرم، سراپا خلق، مجسم رونق افزائے انجمن، قدر دانِ اہل سخن، طبع سلیم و مناسب و رود"۔ شوق کو ان سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا تھا۔ انھوں نے قرآنی رسم خط میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ بقول شوق انھیں ملا منو نثار سے تلمذ تھا۔ اور مرزا مظہر کے تربیت یافتہ تھے۔ فیض اللہ خاں نے پانچ اشعار اپنے ہاتھ سے لکھ کر شوق کی نذر کیے تھے جو شوق نے اپنے تذکرہ میں نقل کیے ہیں۔ مرزا صاحب کو انسے بہت محبت تھی۔ ایک خط میں ان کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ فیض اللہ خاں

کی خوبیوں کے بارے میں کیا تحریر کروں تمام دنیا کے مناقب و محاسن اس جوان میں جمع ہو گئے ہیں۔ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہوں: یادگار ضیغم (قلمی، ادارۂ ادبیات اردو) ص/ ۵۸۷ خم خانۂ جاوید جلد اول ص/ ۱۲۱۔ طبقات الشعراء (قلمی۔ آصفیہ) ورق ۲۱۳ ب، ۲۱۴ الف، تذکرہ ہندی گویان ص/ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ تذکرۂ کمال (قلمی۔ سالار جنگ)

(۲) نواب ارشاد خاں کے والد امین الدولہ امین الدین خاں بہادر سنبھلی تھے۔ یہ سنبھل کے شیخ زادوں میں سے تھے۔ امین الدین خاں نے ملازمت کا آغاز جہاں دار شاہ کی نوکری سے کیا۔ محمد فرخ سیر کے عہد میں یساولاں میں داخل ہو گئے۔ فردوس آرام گاہ کے عہد میں میر توزک مقرر ہوئے رفتہ رفتہ چہار ہزاری منصب پر فائز ہوئے۔ پھر شش ہزاری منصب شش ہزار سوار اور امین الدولہ خطاب ملا۔ شہنواز خاں نے لکھا ہے کہ عیش و عشرت میں مشغول رہتے تھے۔ نادر شاہ کے ہندوستان سے جانے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ امین الدولہ کے دو لڑکے تھے۔ امین الدین خاں اور ارشاد خاں۔ مرزا صاحب نے ارشاد خاں کے ساتھ نواب اعتضاد الدولہ بھی لکھا ہے جو بظاہر ان کا خطاب ہے۔ مرزا صاحب کو ان سے بڑی محبت تھی۔ اکثر خطوں میں ان کا ذکر ہے۔ ایک خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نواب ارشاد خاں، میر انتظام الدین خاں انتظام الدولہ خانخاناں کے ملازم تھے۔ ایک خط میں مرزا صاحب نے ان کی وفات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ "نواب ارشاد مغفور یہاں سے اواخر صفر میں روانہ ہوئے تھے (انھوں نے) مراد آباد کی حدود میں بادشاہ کو پا لیا اور لشکر کے ہمراہ دہلی کا قصد کیا۔ ۱۳ ربیع الآخر کو شہر میں داخل ہوئے۔ دو گھڑی بعد انہیں ٹھنڈک

لگ گئی۔ سرد ہو گئے۔ اور جان خدا کو سونپ دی۔ قدیم حویلی میں انہیں دفن کر دیا۔ دل پر ایسا داغ چھوڑا ہے کہ اس کا مرہم نہیں۔ ملاحظہ ہو: ماثر الامرا جلد اول ص / ۳۵۸ - ۳۵۹ مقامات مظہری ص / ۸۵ ؛ تاریخ امروہہ جلد اول ص / ۴۸۔

(۳) ظفر علی خاں نواب ارشاد خاں کے صاحبزادے تھے۔ مرزا صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت میں بہت محنت کی تھی۔ جس کا بعض خطوط میں ذکر بھی ہے۔

مکتوب ۲۸

(۱) مولوی ثناء اللہ سنبھلی مرزا صاحب کے خلیفہ تھے۔ انھوں نے علم حدیث و قرآن شاہ ولی اللہ سے حاصل کیا۔ اور خواجہ موسیٰ خاں سے بیعت ہوگئے بعد ازاں مرزا مظہر سے کمالات باطنی حاصل کئے اور سلوک طریقہ کے انتہائی مقامات پر پہنچ گئے۔ سنبھل میں علوم ظاہری و باطنی کے درس دیتے تھے۔ مقامات مظہری ص / ۳، ۴، ۷۔

مکتوب ۳۰

(۱) محمد منیر حضرت شیخ فرید گنج کی اولاد میں سے تھے۔ مرزا صاحب سے بیعت تھے۔ بہت جلد اعلیٰ مقامات پا لیے تھے۔ تمام رات مراقبہ کرتے رہتے تھے۔ ذات الصدر کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال فرما گئے۔ مرزا صاحب کو ان کی وفات کا بہت صدمہ تھا۔ مولوی ثناء اللہ سنبھلی کے خط میں لکھتے ہیں: کہ محمد منیر کے انتقال کا ہم کو سخت صدمہ ہوا ہے۔

مکتوب ۳۱

(۱) سکھوں نے پنجاب میں بہت سر اٹھا رکھا تھا۔ یہ لوگ بہت دلیر اور

بہادر تھے۔ اس لیے مرکزی حکومت کی کمزوری کا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ۱۷۶۲ء میں جب احمد شاہ ابدالی ہندوستان آیا تو اُس نے کشمیر فتح کرنے کے ساتھ ساتھ پنجاب میں سکھوں کی شورش کا بھی انسداد کر دیا۔ ۱۲ر دسمبر ۱۷۶۲ء کو ابدالی لاہور سے اپنے وطن کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی سکھوں کی شورشیں پھر شروع ہو گئیں۔ جن میں ابدالی کے صوبہ دار زین خاں کی بدمعاملگی اور لالچ کو زیادہ دخل تھا۔ ۱۷۶۳ء میں ابدالی پورے سال اپنے ملک کے معاملات میں الجھا رہا۔ خراسان کی بغاوت نے اسے اتنا وقت اور موقع ہی نہیں دیا کہ وہ ہندوستان کی طرف توجہ کرتا۔ ۴ر نومبر ۱۷۶۳ء کو سکھ امرتسر میں جمع ہوئے اور انھوں نے غیر ملکی لوگوں سے اپنے مقدس مقامات آزاد کرانے کی قسم کھائی۔ دسمبر ۱۷۶۳ء میں چالیس ہزار سکھوں نے سرہند پر حملہ کر دیا۔ زین خاں نے معمولی فوج کے ساتھ سکھوں کا مقابلہ کیا۔ ابدالی فوج کو شکست ہوئی زین خاں مارا گیا۔ سکھوں نے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ بقول جادو ناتھ سرکار، سکھوں نے شہر کو لوٹ کر بالکل تباہ و برباد کر دیا اور شہر کو جنگل بنا دیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مغل حکومت کا زوال جلد دوم ص ۴۹۰۔ ۴۹۳۔

(۲) مولوی غلام یحییٰ مرزا صاحب کے خلیفہ تھے قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد ظاہری علوم حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ علمِ معقول کی کتابوں پر مفید حواشی بھی لکھے ہیں۔ پہلے قادریہ سلسلے کے ایک بزرگ سے بیعت ہوئے۔ برسوں ذکر اور شغل باطنی میں مصروف رہے۔ ان کی پوری زندگی صبر و قناعت اور استغنا کا ایک مکمل نمونہ تھی۔ جب مرزا صاحب کے کمالات کی شہرت سنی تو یوپی سے دہلی آئے۔ اور مرزا صاحب سے بیعت

ہوئے۔ پانچ سال تک مرزا صاحب سے کسب سلوک کیا اور پھر اپنے وطن واپس چلے گئے۔ ان کی وفات سے متعلق روایت ہے کہ خاندان قادریہ میں۔ جو ان کے شیخ تھے ایک دفعہ بیمار پڑ گئے۔ انھوں نے شیخ کا مرض سلب کر لیا۔ شیخ تندرست ہو گئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ مرزا صاحب کو ان کی وفات کا بہت صدمہ تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ مولوی غلام یحییٰ کی وفات کے زخم کا کوئی مرہم نہیں ہے۔ مکتوب ۴۶ میں بھی مرزا صاحب نے ان کی وفات کا ذکر کیا۔ اور سنہ تحریر ۱۱۸۶ھ درج ہے جس کا مطلب ہے کہ ۱۱۸۶ھ میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ مقامات مظہری ص/ ۷۹۔ ۸۰۔

(۳) یہ غالباً مرزا صاحب کے صاحبزادے تھے۔ شاہ علی اور پیر علی انکے نام تھے۔ دیباچہ میں ان پر بحث کی جا چکی ہے۔

مکتوب ۳۲

(۱) شاہ محمد سالم بھی مرزا صاحب کے خلفاء میں تھے۔ انھوں نے دس سال تک مرزا صاحب سے کسب فیض کیا تھا۔ اور اجازت تعلیم طریقت پا کر رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مقامات مظہری ص/ ۷۵۔ ۷۶۔

مکتوب ۳۳

نعیم اللہ بہرائچی بھی مرزا صاحب کے مرید اور خلیفہ تھے۔ علم معقول و منقول کی تحصیل کے بعد مرزا صاحب کے ایک خلیفہ محمد جمیل کے حلقہ میں شامل ہوئے۔ پھر دہلی آکر مرزا صاحب سے بیعت ہوئے۔ چار سال تک مرزا صاحب کی خدمت میں رہے۔ اور مقامات عالی پر پہنچے۔ خرقہ، اجازت اور خلافت لے کر اپنے وطن چلے گئے۔ مرزا صاحب کہا کرتے تھے کہ دوسروں کو جو فائدہ بارہ سال کی مدت میں ہوتا ہے وہ نعیم اللہ کا چار سال میں ہو گیا۔

مقامات مظہری ص/ ۸۰-۸۱۔ نعیم اللہ بہرائچی نے مرزا صاحب کے سوانح "معمولات مظہریہ" کے نام سے لکھے ہیں جس میں مرزا صاحب کی تعلیمات و ملفوظات بھی شامل ہیں۔

(۲) محمد قاسم کسی امیر کے ملازم تھے کیوں کہ مکتوب ۳۶ میں جو محمد قاسم کے نام ہے مرزا صاحب نے برج لال نامی کسی نوجوان کی سفارش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اپنے آقا کو اس کا مشتاق کردو۔ غالباً یہ عماد الملک یا انتظام الدولہ کے ملازم تھے۔

(۳) شاہ شفیع۔ مقامات مظہری سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ مرزا صاحب کے مرید تھے۔ اور مقامات مظہری کی تالیف کے وقت حیات تھے۔ مقامات مظہری ص/ ۸۳۔

مکتوب ۳۴

(۱) نجف خاں شاہِ ایران شاہ حسین خاں صفوی کے وزیر اعظم آغا نجف کا پوتا تھا۔ یہ اصفہان میں ۱۷۳۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کی بہن صفدر جنگ کے سب سے بڑے بھائی محمد محسن سے بیاہی ہوئی تھی جس کے ساتھ وہ لڑکپن میں ہندوستان آیا۔ اور الہ آباد کے حاکم محمد قلی خاں کے ہاں ملازم ہو گیا۔ جب ۱۷۶۱ء میں شجاع الدولہ نے محمد قلی خاں کو قتل کر دیا تو نجف خاں فرار ہو کر بنگال پہنچا۔ جہاں نواب قاسم علی خاں نے اسے ملازم رکھ لیا اور تین لاکھ روپے دیے تاکہ نجف خاں فوج تیار کرے جب ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی کے بعد نجف خاں نے انگریزوں سے مل کر شجاع الدولہ پر حملہ کیا اور الہ آباد کے قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ کرا دیا تو نجف خاں کو شاہی جنرل تسلیم کر لیا گیا۔ کیوں کہ انگریز سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے شاہ عالم ثانی

کے نام پر جنگ کر رہے تھے۔ انگریزوں کی سفارش ہی پر اسے کوڑا کا شاہی فوجدار مقرر کیا گیا لیکن پورا لگان وصول نہ کر سکے الزام میں تین سال بعد اسے برطرف کر دیا گیا۔ اور وہ ایک سال تک الہ آباد میں بیکار پڑا رہا۔ مئی ۱۷۷۱ء میں جب بادشاہ نے دہلی کا قصد کیا تو اسکے بھی دن پھرے شاہی فوج کا کپتان مقرر ہوا اور فوج کو ٹھیک طریقے سے مسلح کرنے کے لیئے اسے پچاس ہزار روپے ملے۔ جب بادشاہ دہلی میں داخل ہوا تو نجف خاں بھی ساتھ تھا۔ ۵ / جون ۱۷۷۲ء کو نجف خاں میر بخشی مقرر ہوا۔ ۱۷۷۹ء میں وکیل مطلق ہوا۔ ۱۷۸۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ جب بادشاہ دہلی آیا تھا۔ تو اسے ہر طرف سے دشمنوں نے گھیر رکھا تھا۔ اور یہ دہلی جاٹ، مرہٹے، سکھ اور روہیلوں کی طاقت کی آزمائش گاہ بنی ہوئی تھی۔ صرف نجف خاں کا دم تھا کہ اس نے ان تمام طاقتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ نجف خاں نے خاص طور پر روہیلوں کی طرف توجہ کی کیوں کہ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت مغل حکومت کے لیے مستقل خطرہ تھی۔ دہلی دربار عرصہ سے شیعہ اور سنی فرقوں کا اکھاڑہ رہ چکا تھا۔ ایرانی اور تورانی گروہوں کی مخاصمت کی بڑی وجہ یہ مذہبی اختلاف تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب سادات بارہ کے دو بھائی برسر اقتدار آئے تو شیعیت کو بہت عروج ہوا۔ صفدر جنگ اور عماد الملک کی چشمکوں کی ایک بڑی وجہ یہ تھی۔ نجف خاں کٹر شیعہ تھا۔ اس کے زمانے میں سُنی علماء پر بہت ظلم ہوا۔ اور اکثر لوگ اس سے متنفر ہو گئے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں: جس دن سے نجف خاں آیا ہے بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب کی حالت خراب ہے۔ مصحفی نے تذکرۂ ہندی گویان میں لکھا ہے: نجف خاں کے دور میں بارہ سال تک میں خانہ نشین رہا۔ میں اس حشر اجساد و اموات میں تلاش معاش کے لیے ہرگز گھر سے نہیں نکلا۔ مولانا فخر الدین بھی نجف خاں سے بہت ناراض

تھے، مرتے وقت نجف خاں نے مولانا کو بلوایا۔ مولانا چلے تو گئے مگر اس سے کہا کہ ہم میں ہرگز کوئی واسطہ نہیں ہے۔ صرف عیادت کو آگیا ہوں۔ نجف خاں کے جنازے میں بھی مولانا فخر الدین شریک نہیں ہوئے۔ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو: مغل حکومت کا زوال جلد سوم، تذکرہ ہندی گویان ص ۲۴۸، فواعد فخریہ (قلمی۔ آصفیہ) ص/ ۳۲، مختصر تاریخ ہندوستان (قلمی آزاد لائبریری علیگڑھ) ص ۱۰۷۔

(۲) مجد الدولہ کا پورا نام عبد الاحد خاں تھا۔ یہ عبد المجید خاں کا لڑکا تھا جو کشمیر سے ہندوستان آکر عنایت اللہ خاں کے ملازم ہوئے تھے۔ عنایت اللہ خاں کی وفات کے بعد عبد المجید خاں اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کے ملازم ہوئے۔ کچھ دن بعد شاہی ملازمت مل گئی۔ اپنی عقلمندی اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے بادشاہ کی نظروں میں چڑھ گئے۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد محمد شاہ نے انہیں ہزاری منصب، علم، نقارہ، پالکی جھالردار اور خطاب مجد الدولہ عنایت کیا۔

عبد الاحد خاں پہلے نجیب الدولہ کا ملازم ہوا۔ نجیب الدولہ کی وفات کے بعد ضابطہ خاں کا ملازم ہوگیا۔ ضابطہ خاں کی شکست اور فرار کے بعد ۳۰/ مارچ ۱۷۷۲ء کو یہ شاہ عالم ثانی کی خدمت میں آیا اور معافی مانگ لی۔ ایک سال بے روزگار رہا۔

مکتوب ۴۴

دوندے خاں بھتیجا تھا شاہ عالم خاں کا جن کے غلام داؤد خاں نے روہیلکھنڈ کی بنیاد رکھی۔ دوندے خاں، داؤد خاں کے زمانے ہی میں ہندوستان آگیا تھا۔ اپنی بہادری اور سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے بہت جلد روہیلہ

سرداروں میں نمایاں ہوگیا۔ داؤد خاں کے بعد علی محمد خاں اور ان کے بعد حافظ رحمت خاں کے ساتھ رہا۔ بسولی مراد آباد، چاند پور اور سنبھل کا حاکم مقرر ہوا۔ وہ اپنی ایمانداری، بہادری اور انتظامی صلاحیتوں میں شہرت رکھتا تھا۔ ۱۷۷۱ء میں بسولی میں انتقال ہوا۔ نجیب الدولہ اس کا داماد تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، نجیب الدولہ مرتبہ شیخ عبدالرشید، حافظ رحمت خاں ، تاریخ اودھ۔

(۲) حافظ رحمت خاں کے والد شاہ عالم خاں روہ کے رہنے والے ایک بزرگ تھے۔ داؤد خاں انہیں بزرگ کا غلام تھا جسے انھوں نے اپنے لڑکے کی طرح پرورش کیا تھا۔ داؤد خاں نے ہندوستان میں کٹیہر کے علاقہ میں آکر اچھی خاصی جمعیت اکٹھا کرلی داؤد خاں کی وفات کے بعد اس کا متبنیٰ لڑکا تھا علی محمد جو اس جمعیت کا سردار ہوا۔ مگر اکثر اس کی فرمانبرداری سے گریز کرتے تھے اس لئے علی محمد خاں نے حافظ رحمت خاں کو روہ سے بلوا لیا۔ حافظ کچھ دن ہندوستان رہ کر واپس چلے گئے مگر علی محمد خاں کے اصرار پر تین سال بعد پھر واپس آگئے۔ اور اس دفعہ مستقل قیام کا ارادہ کرلیا۔

کٹیہر کے علاقہ میں روہیلوں کی دست درازیوں سے تنگ آکر جاگیرداروں نے مرکزی حکومت سے شکایت کی۔ محمد شاہ نے ۱۷۴۲ء میں راجہ پرندن کھتری کو روہیلوں کی طاقت کچل دینے پر مقرر کیا۔ مگر علی محمد خاں اور حافظ الملک کی بہادری نے راجہ کو شکست دی۔ راجہ اور اس کا لڑکا مارا گیا۔ روہیلوں کے ہاتھ کافی مال و دولت آیا، شاہ آباد، مراد آباد، سنبھل اور دوسرے پرگنات پر روہیلوں کا قبضہ ہوگیا۔ کچھ دن بعد حافظ الملک نے راجہ کمایوں پر حملہ کیا اور المورہ پر قبضہ کرلیا۔ اس بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر محمد شاہ بادشاہ پریشان ہوگیا۔ ۱۷۴۵ء میں محمد شاہ نے خود روہیلوں پر حملہ کیا۔ علی محمد خاں خود کو

معہ اپنے لڑکوں کے بادشاہ کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بادشاہ علی محمد خاں کو لے کر دہلی پہنچ گیا۔ کچھ ہی دن بعد حافظ رحمت خاں سات ہزار روہیلوں کی فوج لے کر دہلی پہنچ گئے۔ اور نواب علی محمد خاں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ بادشاہ کو مجبوراً انہیں رہا کرنا پڑا۔ اور نواب علی محمد کو سرہند کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ حافظ رحمت نے یہاں بھی کارہائے نمایاں دکھائے۔ پہلی جنگ بہارا مل والئ رائے پور سے ہوئی جسے شکست ہوئی۔ کچھ دن بعد قصبہ جوت پور پر قبضہ کر لیا۔ جب ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی ہندوستان کی طرف آیا تو بادشاہ نے اس خوف سے کہ کہیں یہ لوگ ابدالی سے نہ مل جائیں انہیں واپس بلا لیا اور نواب علی محمد خاں کو روہیلکھنڈ کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ نجف خاں کی سفارش پر اسے نائب وزیر مقرر کیا گیا۔ اور مجدالدولہ بہرام جنگ کے خطابات عنایت ہوئے۔ اپنی ظاہری آداب و اطوار کی خوبی اور عیاری و مکاری سے بہت جلد بادشاہ کو عزیز ہو گیا۔ لیکن اس میں حاکم ہونے کی صلاحیتیں تھیں اور نہ سپاہی ہونے کی۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار صرف سازش تھا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے نجف خاں کے خلاف سازشیں شروع کیں۔ نجف خاں جب جاٹوں سے نبرد آزما تھا تو مجدالدولہ نے ضابطہ خاں کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ کچھ دن بعد اسی ضابطہ خاں کے خلاف بادشاہ کو اکسایا۔ چونکہ ضابطہ خاں اپنی جاگیر کی سالانہ آمدنی بادشاہ کو پیش کرنے میں مجبور تھا اس لئے مجدالدولہ نے بادشاہ کو جنگ پر اکسایا۔ عبدالقاسم خاں جو مجدالدولہ کا چھوٹا بھائی تھا فوج لے کر ضابطہ خاں کے مقابلہ پر بھیجا گیا اور مارا گیا۔ ان سازشوں کی وجہ سے نجف خاں کے سپہ سالار افراسیاب خاں نے ۱۵ نومبر

۱۷۷۹ء کو اسے گرفتار کرلیا اور پھر وہ کبھی آزاد نہ ہو سکا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مآثر الامرا جلد ۳ ص/ ۸۰۷ و ۸۰۸، مغل حکومت کا زوال جلد ۳ ص/ ۸۶-۸۸، ۱۷۳-۱۷۶۔ شاہ عالم فرینکلن ص/ ۸۲-۹۶۔

مکتوب ۳۷

(۱) اس خط کا سنہ تحریر ۱۱۸۶ھ ہے۔ کیوں کہ خط میں مولوی غلام یحییٰ کے انتقال کی خبر ہے جو ۱۱۸۶ھ کا واقعہ ہے۔ دیکھیے مکتوب ۳۱ حاشیہ (۲)۔

مکتوب ۴۰

(۱) یہ خط غالباً ۱۱۸۲ھ میں لکھا گیا ہے۔ کیوں کہ صاحب بستان بے خزاں نے مرزا صاحب کے مستقل قیام کے بارے میں لکھا ہے۔ چونکہ یہ تذکرہ ۱۱۸۱ھ میں تالیف ہوا تھا اس لئے شاید اسی سال کا واقعہ ہو۔ مؤلف نے لکھا ہے:

> چوں کہ اس شہر دہلی کی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ ارشاد خاں بن نواب امین الدولہ انصاری سنبھلی کے خلوص اور ربط کی وجہ سے سنبھل مراد آباد میں قیام کر کے گوشہ گیر ہو گئے ہیں۔
> بستانِ بے خزاں (قلمی۔ رام پور)

(۲) ۱۴ر ستمبر ۱۷۴۹ء کو نواب علی محمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ نواب نے مرتے ہوئے حافظ رحمت خاں کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد صفدر جنگ نے روہیلوں کی تخریب کے خیال سے قطب الدین خاں کو روہیلکھنڈ کی سند دلادی۔ مراد آباد کے قریب قطب الدین خاں اور حافظ رحمت خاں کی جنگ ہوئی اور قطب معہ ہمراہیوں کے مارا گیا۔ صفدر جنگ نے اس دفعہ روہیلکھنڈ کی سند نواب قائم خاں بنگش کو دلادی۔ قائم خاں فوج لے کر روہیلکھنڈ پر حملہ آور ہوا۔ قائم خاں مارے گئے اور پھر حافظ رحمت کو فتح

ہوئی۔ اور اس دفعہ بدایوں، مراد آباد، اسہت اور پریم نگر بھی روہیلکھنڈ میں شامل ہو گئے۔ کچھ ہی دن میں حافظ رحمت نے دامنِ کوہ کا بہت بڑا علاقہ فتح کر لیا۔ پرگنہ سنبھ، کھیرا گڑھ، بھرتاپور، بجوربا، وریاپور، سنگلیا ملہوارہ وغیرہ بھی روہیلوں کے قبضے میں آ گئے۔ جب صفدر جنگ نے مرہٹوں کی مدد سے احمد خاں بنگش والیٔ فرخ آباد پر حملہ کیا تو احمد خاں بنگش نے روہیلکھنڈ میں پناہ لی۔ صفدر جنگ نے روہیلکھنڈ پر حملہ کر دیا۔ چار مہینے کی جدوجہد کے بعد صفدر جنگ کو صلح کرنی پڑی۔

صفدر جنگ کے بعد جب شجاع الدولہ جانشین ہوا تو اسے بھی روہیلوں کی فکر ہوئی۔ اس نے انگریزوں کی مدد سے حافظ رحمت خاں پر حملہ کر دیا۔ کٹرا میراں پور کے قریب جنگ ہوئی۔ ۲۳؍اپریل ۱۷۷۴ء کو حافظ رحمت میدان جنگ میں مارے گئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حیات حافظ رحمت خاں، تاریخ اودھ جلد اول و دوم، مغل حکومت کا زوال جلد دوم۔

مکتوب ۴۶

(۱) مرزا صاحب کے مرید تھے۔ علوم ظاہری سے بہرہ اندوز تھے۔ حضرت خواجہ موسیٰ خاں کی صحبت سے بھی استفادہ کیا تھا۔ سات سال تک ان کی صحبت میں رہے تھے۔ حضرت محمد زبیر کے خلیفہ خواجہ ضیاء اللہ اور شاہ عبدالعدل اور شیخ محمد عابد کے خلیفہ شاہ عبدالحفیظ کی صحبت سے استفادہ کا اتفاق ہوا اور مرزا صاحب سے بیعت ہوئے۔ برسوں ساتھ رہے۔

(۲) اس خط پر مرزا صاحب نے سنہ تحریر ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) لکھا ہے۔ اس میں بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب مرہٹوں اور ضابطہ خاں کی لڑائی کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس لڑائی کی ابتدا اس طرح

ہوئی کہ نجیب الدولہ کے انتقال (۱۳ راکتوبر ۱۷۷۰ء) کی خبر شاہ عالم کو پہونچی جو اس وقت الٰہ آباد میں مقیم تھے تو نجیب الدولہ سے تمام دشمنی کے باوجود شاہ عالم نے ان کے لڑکے ضابطہ خاں کو تعزیت نامہ بھیجا۔ اور اس کے ساتھ میر بخشی کا عہدہ اور امیر الامراء کا خطاب بخشا اور حکم دیا کہ ضابطہ خاں بادشاہ کو دہلی لے کر جائیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بادشاہ کا یہ مطالبہ تھا کہ باپ کا عہدہ اور جائیداد کا مالک ہونے کی پیشکش کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں بادشاہ کے دل میں ضابطہ خاں کے خلاف کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اور ہوتا بھی کیسے بقول "سرکار" ضابطہ خاں دہلی میں بادشاہ کی ماں اور متعلقین کی حفاظت کر رہا تھا جلاوطن بادشاہ کے پاس اپنی کوئی فوج بھی نہیں تھی ضابطہ خاں نے عہدہ تو قبول کر لیا لیکن حساب دینے سے انکار کر دیا باشاہ کو مجبور ہو کر مرہٹوں سے مدد مانگنی پڑی شاہ عالم نے مادھوجی سندھیا سے سانٹھ گانٹھ کرلی۔ بادشاہ مرہٹوں کے ساتھ دہلی کیطرف روانہ ہوگیا اور فرخ آباد پہونچا۔ شاہ عالم نے ضابطہ خاں سے صلح کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ اور بادشاہ کے دہلی پہنچنے سے پہلے ضابطہ خاں دہلی سے فرار ہوگیا۔ دہلی میں گیارہ دن قیام کے بعد بادشاہ ضابطہ خاں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ مغل فوج کا سردار نجف خاں تھا۔ اور مرہٹہ فوج کے ساتھ تکوجی ہالکر، مادھوجی سندھیا وغیرہ تھے۔ بادشاہ خود بھی فوج سے دس میل پیچھے تھا۔ یہ فوج لونی، باغپت اور غوث گڑھ ہوتی ہوئی چاندپور یعنی گنگا کے مغربی کنارے پر پہنچ گئی اس دوران میں ضابطہ خاں نجیب آباد کے قلعہ پتھر گڈھ میں اپنا خزانہ اور بیوی بچوں کو ایک مختصر سی فوج کے ساتھ چھوڑ کر سکرتال پہنچ گیا جہاں اس نے مورچہ لگایا۔ چوں کہ سردیوں کا موسم تھا۔ گنگا میں بالکل پانی نہیں تھا۔ مغربی کنارے پر شاہی فوج اور مرہٹے تھے۔ اور مشرقی کنارے پر اٹھائیس میل

تک روہیلے پھیلے ہوئے تھے۔ مرہٹوں نے چاندی گھاٹ (ہر دوار سے بالکل نیچے) سے گنگا پار کی۔ ۲۳؍ فروری ۱۷۷۲ء کو سورج نکلنے سے دو گھنٹہ پہلے چاندی گھاٹ پر دریا پار کر کے حملہ کر دیا۔ چونکہ روہیلے اس سے بے خبر تھے اس لیے گھبرا گئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد انھوں نے حالات پر قابو پا لیا۔ اور جوابی حملہ کیا۔ مرہٹوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس دوران میں نجف خاں اپنی فوج لے کر آگیا۔ اس کے خطرناک گولہ بارود نے جنگ کا تقریباً فیصلہ کر دیا۔ روہیلوں کے بڑے بڑے سردار جو سب سے آگے تھے توپوں کے گولوں کی نذر ہو گئے۔ روہیلہ فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ صرف سعادت خاں آفریدی دو چار سو سپاہیوں کے ساتھ میدان میں جما رہا۔ جب کہ مرہٹوں اور شاہی فوج کے سپاہیوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں تھی۔ آفریدی کا گھوڑا زخمی ہو کر گر گیا۔ خود اس کی رانوں پر گولیاں لگیں لیکن اس نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ اور دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر لڑائی میں حصہ لیتا رہا۔ یہاں تک کہ زخموں نے اُسے گرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے گرتے ہی تمام روہیلے فرار ہو گئے ضابطہ خاں فرار ہو کر سکرتال پہونچا۔ لیکن یہاں بھی خود کو محفوظ نہ پا کر صرف چالیس ملازموں کے ساتھ اپنے ہاتھی پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ مرہٹوں نے روہیلوں کا تعاقب کیا۔ سکرتال سے ہوتے ہوئے مرہٹے بھی پتھر گڑھ کے قلعہ پر پہنچے اور محاصرہ کیا۔ قلعہ میں بوڑھا سردار سلطان خاں تھا پندرہ دن محاصرہ رہا۔ آخر اس شرط پر صلح ہوئی کہ مرہٹے کسی کو جان سے نہیں ماریں گے۔ قلعہ کا دروازہ کھولا گیا۔ اور خوب لوٹ مار کی گئی۔ مرزا صاحب کی پوری ہمدردیاں روہیلوں کے ساتھ تھیں۔ انھوں نے ایک خط میں ضابطہ خاں کے باپ نجیب الدولہ کی تعریف بھی کی ہے اور دوسرے نجف خاں

سے مرزا صاحب بہت متنفر تھے۔ اس جنگ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں:
مغل حکومت کا زوال جلد سوم ص/ ۲۸۔ ۵۵، تاریخ اودھ حصہ سوم۔

مکتوب ۴۵

(۱) امتیاز علی خاں صاحب عرشی اس خط کی عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں:
جس فتنے کا مرزا صاحب نے اپنے مکتوب میں حوالہ دیا ہے اس سے مرہٹوں
کی دلی پر چڑھائی مراد ہے۔ انھوں نے ۱۱۸۳ھ (۶۹، ۶۱) میں بہت بڑے
لشکر کی صورت میں دریائے چنبل عبور کر کے دلّی کا رخ کیا تھا۔ مگر نواب
نجیب الدولہ بہادر نے فرخ آباد کی تسخیر کی طرف متوجہ کر دیا۔ آغاز ۱۱۸۴ھ
۱۷۷۰ء میں یہ مہم مرہٹوں نے شروع کر کے قلعہ شکوہ آباد روہیلوں سے لینے
کے بعد صلح کر لی۔ اس سال غالباً رجب میں نواب نجیب الدولہ بہادر کا
انتقال ہو گیا۔ اور مرہٹے دلّی کی طرف بڑھے۔ اس سے یہ قیاس کرنا بیجا نہیں
کہ ۱۱۸۵ھ میں مرزا صاحب آنولے یا سنبھل میں تھے۔ دستور الفصاحت حواشی ص ۶۶
(۲) و (۳) خانساماں اور بخشی بڑے بہادر اور جری سپاہی تھے۔ حقیقت
یہ ہے کہ روہیلوں کی طاقت کا بہت کچھ انحصار ان ہی لوگوں پر تھا۔
(۴) ملاحظہ ہو مکتوب ۴۴ حاشیہ (۲)

مکتوب ۵۳

(۱) مولوی کلیم اللہ بنگالی، مرزا صاحب کے خلیفہ تھے۔ انھوں نے مرزا
صاحب سے کسب سلوک کیا تھا۔ برسوں مرزا صاحب کے پاس دہلی میں
رہے۔ مقاماتِ مظہری ص/ ۸۲۔ ۸۳۔

مکتوب ۵۵

(۱) ایک خط میں مرزا صاحب نے میر محمد مبین کو حشمت خاں کا لڑکا

لکھا ہے۔ بقول شاہ غلام علی، کمالات ظاہر و باطن سے آراستہ ہے۔ مرزا صاحب سے کسب سلوک کیا تھا۔ مرزا صاحب ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ میر مبین اولیاء خدا کبیر بعد میں صغیر سے ملوں۔

(۲) میر محمد معین چھوٹے بھائی تھے۔ میر محمد مبین کے۔

مکتوب ۶۰

(۱) یہ محمد شاہ کے وزیر قمر الدین کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ بزدل ہونے کی وجہ سے ہمیشہ جنگ و جدل سے دامن کشاں رہا۔ بقول "سرکار" اس میں فوجی زندگی کی اہلیت و قابلیت تھی اور نہ حوصلہ۔ صفدر جنگ کے باغی ہو جانے پر جب احمد شاہ بادشاہ نے اس سے قلمدانِ وزارت چھینا تو انتظام الدولہ نے وزارت کا عہدہ سنبھالا۔ مگر پندرہ مہینہ (مارچ ۵۳، ۱ء سے مئی ۵۴، ۱ء سے زیادہ نہیں رہا کہ عماد الملک نے اپنی طاقت کے زور سے یہ عہدہ چھین لیا۔ ۱۷۵۶ء میں جب ابدالی نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا تو عماد الملک کو معافی مانگنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ دراصل لاہور ابدالی کے قبضہ میں تھا۔ اور وہاں ابدالی کی طرف سے مغلانی بیگم صوبہ دار مقرر تھی۔ عماد الملک نے لاہور پر حملہ کیا اور مغلانی بیگم کو گرفتار کر لیا۔ یہ خبر سنتے ہی ابدالی پھر ہندوستان آیا۔ عماد الملک نے معافی مانگی لیکن وزارت کا عہدہ ۲۶ر جنوری ۱۷۵۷ء کو انتظام الدولہ کو بخش دیا۔ صاحب تاریخ احمد لکھتے ہیں: "محمد عالمگیر غازی درجہ پادشاہی بدستور و انتظام الدولہ خلف قمر الدین خاں وزیر را وزیر پادشاہ مذکور و نواب نجیب الدولہ را بمرتبہ امیر الامرائی سر فراز فرمودہ" چوں کہ انتظام الدولہ نے ابدالی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اُسے وزارت بخش دی گئی تو وہ دو کروڑ روپیہ نذرانہ گزرانے گا۔ چنانچہ ابدالی نے اس نذرانہ

کا مطالبہ کیا۔ مگر انتظام الدولہ نے معذوری کا اظہار کیا۔ ابدالی کے حکم سے انتظام الدولہ کو سرِ دربار ذلیل کیا گیا۔ اور اس کی ماں یعنی قمر الدین وزیر کی بیوی شولاپوری بیگم کو سرِ دربار بلا کر ذلیل کیا گیا۔ اس نے ایک حویلی کا پتہ بتایا جسے فوراً ڈھا دیا گیا۔ اور نقد، جواہرات نقرئی و طلائی ظروف اور ایسے ہی قیمتی اشیار برآمد کی گئیں ابدالی کے حکم کے مطابق ۳ر اپریل ۱۷۵۷ء کو عماد الملک کو وزارت عنایت کی گئی۔ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء میں جب ابدالی نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا اور نجیب الدولہ کو امیر الامراء مقرر کیا گیا تو عماد نے ہالکر اور کناتھ راؤ کو دکن سے بلا کر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ ۴۵ دن مقابلہ ہوا۔ آخر نجیب الدولہ نے ہالکر کو رشوت دے کر اپنی طرف ملا لیا اور صلح ہو گئی۔ نجیب الدولہ دہلی چھوڑ کر اپنے علاقے کی طرف چلا گیا۔ عماد الملک نے ۸ر ربیع الآخر ۱۱۷۳ھ (۲۹ر نومبر ۱۷۵۹ء) کو عالمگیر ثانی کو قتل کر دیا۔ اور ۳۰ر نومبر کو انتظام الدولہ کو قلعہ میں پھانسی دیدی گئی۔ اس کی لاش ایک بڑے پتھر سے باندھ کر دریائے جمنا میں ڈال دی گئی۔ (۱) مرزا مظہر کے جن خطوط پر مکتوب الیہ کے نام ہیں ان میں دو خطوط انتظام الدولہ کو لکھے گئے ہیں۔ ایک خط میں مرزا لکھتے ہیں:-

"..... اشعار آبدار سرکار از نظر گذشت، درست بامزہ است
وفارسی بہتر از ہندی حاجت اصلاح نداشت"

مرزا کے ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتظام الدولہ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ مگر افسوس کہ ہماری نظر سے کوئی ایسا تذکرہ نہیں گذرا جس میں اس کے اشعار ہوتے۔

مکتوب ۶۲

(۱) عماد الملک کا نام میر شہاب الدین تھا۔ یہ فیروز جنگ غازی الدین کا لڑکا تھا۔ جب فیروز جنگ کو احمد شاہ بادشاہ نے دکن کے انتظامات پر مقرر کیا۔ تو دکن جانے سے پہلے فیروز جنگ نے اپنے لڑکے شہاب الدین کو نیابت میر بخشی پر مقرر کرا دیا۔ تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال کے لیے اسے صفدر جنگ کے سپرد کر دیا۔ جب فیروز جنگ کا دکن میں انتقال ہوا تو صفدر جنگ نے لحاظ و مروت سے اسے میر بخشی کا عہدہ دلایا اور بادشاہ نے عماد الملک کا خطاب دیا۔ عماد الملک لڑکپن ہی سے ذہین اور ہوشیار تھا۔ اپنے جوڑ توڑ اور صفدر جنگ کی غلطیوں سے فائدہ اٹھا کر احمد شاہ کو صفدر جنگ کا اتنا مخالف کر دیا کہ صفدر جنگ کو بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنی پڑی۔ صفدر جنگ نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا کر دہلی پر حملہ کیا چھ ماہ تک مسلسل لڑائی رہی۔ عماد الملک کی ہوشیاری سے صفدر جنگ کو شکست ہوئی صفدر جنگ کے بعد وزارت کے عہدے پر قمر الدین وزیر کا لڑکا انتظام الدولہ فائز تھا۔ (اس کی وزارت کا زمانہ مارچ ۱۷۵۳ء سے مئی ۱۷۵۴ء تک ہے) دربار میں انتظام الدولہ کے خلاف بغاوت ہو رہی تھی۔ عماد الملک نے مرہٹہ سردار ہولکر اور خاص طور پر صمصام الدولہ میر آتش کی مدد سے انتظام الدولہ سے وزارت چھین لی اور خود اس عہدہ پر فائز ہو گیا۔ اسے احساس تھا کہ مغل بادشاہ احمد شاہ اس کا سخت مخالف ہے اس لیے عماد نے احمد شاہ اور اس کی ماں کو گرفتار کر لیا۔ اور ایک ہفتہ بعد دونوں کو اندھا کر دیا۔ ۱۱۶۷ھ میں جہاندار شاہ کے پوتے عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا اور پھر پنجاب کے انتظام کی طرف متوجہ ہوا۔ لاہور احمد شاہ درانی کے قبضہ میں

تھا۔ وہ معین الملک کو گورنر بنایا گیا تھا۔ وفات کے بعد اس کی بیوی مغلانی بیگم یہاں کی گورنر تھی۔ احمد شاہ ابدالی اس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ اور عماد نے مغلانی بیگم کو گرفتار کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا اور تین لاکھ روپے کی پیشکش پر آدینہ بیگ کو یہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ جب درانی نے یہ خبر سنی تو فوراً ہندوستان پہنچا۔ آدینہ بیگ فرار ہو گیا۔ عماد کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن اس کے معافی مانگنے اور خود مغلانی بیگم کی سفارش پر اسے رہا کر دیا گیا۔ یہ ۱۱۷۰ھ کا واقعہ ہے۔ درانی نے دو مغل شہزادوں کے ساتھ عماد کو اودھ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہاں سے دولت حاصل کی جائے۔ اسی دوران میں عالمگیر ثانی اور نجیب الدولہ کی ملاقات ہوئی۔ بادشاہ کی شکایت پر احمد شاہ ابدالی نے عماد الملک کو برطرف کر کے نجیب الدولہ کو امیر الامراء کا عہدہ دلایا۔ عماد الملک نے جب یہ سنا تو ہالکر اور رگناتھ راؤ کو دکن سے بلا کر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ پینتالیس دن تک جنگ رہی۔ آخر نجیب الدولہ نے ہالکر کو رشوت دیکر اپنی طرف ملا لیا اور عماد الملک ایک بار پھر دہلی کا ڈکٹیٹر ہو گیا۔ اس نے ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء کو عالمگیر ثانی اور ۳۰ نومبر کو انتظام الدولہ کو قتل کرا دیا۔ درانی نے جب یہ خبر سنی تو پھر دہلی کی طرف آیا۔ عماد الملک فرار ہو کر سورج مل جاٹ کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔ ۱۷۵۹ء سے ۱۷۶۲ء تک عماد الملک سورج مل کے ساتھ رہا۔ پھر فرخ آباد آ گیا۔ کچھ دن بعد حج کو چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر کالپی میں مقیم ہوا۔ جہاں ۱۸۰۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مغل حکومت کا زوال جلد اوّل ص/ ۴۵۔۴۴۳۔۴۴۶ جلد دوم ص/ ۱۰۹ اور ۵۲۷۔۵۲۸، مآثر الامراء جلد دوم ص/ ۸۴۷۔ ۸۵۶، سیر المتاخرین جلد سوم ص/ ۸۹۳۔۹۰۸، دستور الفصاحت دیباچہ

ص/۵۶-۵۷-

مکتوب ۶۶

(۱) عسکری خاں، عماد الملک کا عہدہ دار تھا۔ مرزا صاحب کے کئی خطوط اس کے نام ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے عماد الملک کے مزاج میں اچھا خاصہ دخل تھا۔

(۲) سورج مل جاٹ متبنی تھا راجہ بدن سنگھ والئی بھرت پور کا۔ سورج مل کی خالہ راجہ کی حرم تھی اس لیے سورج مل اکثر حرم میں آتا رہتا تھا۔ راجہ نے اسکی ذہانت سے متاثر ہو کر اُسے گود لے لیا۔ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے سورج مل نے بہت جلد یہ ثابت کر دیا کہ بدن سنگھ کے بعد جاٹوں کی سرداری کا صرف وہی اہل ہے۔ خود راجہ کی حکومت کا نصف آخر دور سورج مل کی تاریخ ہے کیوں کہ راجہ صرف برائے نام رہ گیا تھا۔ سورج مل نے بہت جلد اپنی تلوار کے زور سے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب محمد شاہ بادشاہ نے مئی ۱۷۴۵ء میں علی محمد خاں روہیلہ پر حملہ کیا تو سورج مل بھی بادشاہ کی حمایت میں اس جنگ میں شامل ہوا۔ اسی سال نومبر میں علیگڑھ کے صوبہ دار فتح علی خاں نے اس کی خدمات حاصل کیں۔ اور فتح علی خاں کو اپنے دشمن اسد خاں خانہ زاد پر فتح ہوئی۔ صفدر جنگ نے جب نواب بنگش پر حملہ کیا تھا تو سورج مل بھی صفدر جنگ کے ساتھ تھا۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے متھرا کی صوبہ داری اس کے سپرد کر دی۔ اس طرح سورج مل کو مغل حکومت میں اچھا خاصا عمل دخل ہو گیا۔ وہ ایک ایماندار اور بہادر انسان تھا۔ اس کی آخری لڑائی نجیب الدولہ کے ساتھ دہلی کے پاس ۱۷۶۳ء میں ہوئی جس میں

وہ مارا گیا۔ اور جاٹوں کی وہ طاقت جنہوں نے اکثر لڑائیوں کا فیصلہ کیا تھا ختم ہو گئی۔ ملاحظہ ہو مغل حکومت کا زوال جلد دوم ص ۴۲۴-۳-۴۶۳۔

مکتوب ۷۰

(۱) نواب سے مُراد نواب عماد الملک ہے۔

(۲) جاٹ سے مراد سورج مل جاٹ ہے۔

(۳) نجیب خاں روہیلہ عمر خیل، یوسف زئی سے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے آنولہ آیا تھا۔ اور نواب علی محمد خاں کی فوج میں ملازم ہو گیا۔ اگرچہ وہ بالکل ان پڑھ تھا لیکن خداداد ذہانت، اور خوش قسمتی نے اسے بہت جلد علی محمد خاں کی نظروں میں چڑھا دیا۔ بہت جلد وہ جمعدار ہو گیا۔ جب صفدر جنگ سے گھبرا کر مرہٹے کماؤں کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ تو سعد اللہ خاں نے نجیب خاں کو کماؤں کی پہاڑیوں کی ایک چوکی پر پانچ سپاہیوں کا انچارج مقرر کیا۔ کچھ ہی عرصے بعد نجیب خاں کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اور اس نے ایک روہیلہ سردار دوندے خاں کی لڑکی سے شادی کر لی دوندے اس کی ترقی کا سبب بن گیا۔ دوندے خاں نے چاند پور، نگینہ، شیر کوٹ اور بجنور کے محلات کا عامل مقرر کر دیا۔ جب دہلی میں صفدر جنگ نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تو نجیب خاں اپنی فوج لے کر بادشاہ کی مدد کو آیا صفدر جنگ کی طرف سورج مل جاٹ تھا۔ مرزا صاحب نے اس خط میں اسی واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ چار مہینے تک لڑائی جاری رہی مگر کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ آخر نجیب خاں نے بادشاہ سے مل کر صلح کر لی۔ اسے سہارنپور کی فوجداری دے دی گئی۔ صفدر جنگ اور سورج مل جاٹ اپنے اپنے

علاقوں کو واپس چلے گئے۔ نجیب خاں نے کوشش کر کے بہت جلد احمد شاہ ابدالی سے تعلقات قائم کر لیے جس نے اس کی بہت مدد کی۔ جب دہلی پر حملہ سے فارغ ہو کر واپس جانے لگا تو اس نے عماد الملک کو بادشاہ کا وزیر اور نجیب خاں کو میر بخشی مقرر کر دیا۔ اس وقت عماد الملک متھرا میں تھا۔ نجیب خاں دہلی پہنچ گیا۔ اور میر بخشی، دہلی کا فوجدار اور مختار ہو گیا۔ عماد الملک نے یہ حالات دیکھ کر مرہٹہ سردار ہالکر کو اپنے ساتھ ملا لیا اور دہلی پر حملہ آور ہوا۔ نجیب خاں لڑائی کی تاب نہ لا کر اپنے علاقے میں واپس چلا گیا۔ اور عماد الملک پھر دہلی کا ڈکٹیٹر ہو گیا۔ کچھ دن بعد ابدالی کے آنے کی پھر خبر آئی اور عماد الملک دہلی سے فرار ہو گیا۔ اب نجیب خاں کا زمانہ آچکا تھا۔ دس سال تک یہ بہادر سردار مغل حکومت کو دوبارہ زندہ کرنے میں سرگرداں رہا۔ کوئی طاقت ایسی نہیں تھی جو مغل حکومت کے خلاف ہو اور نجیب خاں نے اسے کچلنے کی کوشش نہ کی ہو۔ ۱۷۶۰ء سے لے کر ۱۷۷۰ء تک مغل حکومت کی تاریخ نجیب الدولہ کے کارناموں کی تاریخ ہے۔ اکتوبر ۱۷۷۰ء میں اس عظیم انسان کا انتقال ہو گیا۔ ملاحظہ ہو: نجیب الدولہ مرتبہ و مترجمہ شیخ عبد الرشید (انگریزی مغل حکومت کا زوال جلد دوم)۔

اسماء الرجال

ص

کتابیات

آثار الصنادید :۔ سرسید احمد خاں ۔ مطبع سید الاخبار ۱۸۴۷ء

اکبر نامہ :۔ ابو الفضل ۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۸۶۹ء

آئین اکبری جلد اول :۔ ابو الفضل ۱۸۶۲ء

الفرقان :۔ بابتہ جمادی الثانی ۱۳۸۰ھ

ارواحِ ثلاثہ :۔ مولانا اشرف علی تھانوی ۔ مکتبہ امداد الغربا سہارنپور۔

بستانِ بے خزاں (قلمی رامپور) فضل علی خاں ۔

تاریخ فیروز شاہی :۔ ضیاء الدین برنی ۔ ایشاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ سنہ ۱۸۶۱ء

تاریخ مشائخ چشت :۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ندوۃ المصنفین دہلی ۔ سنہ ۱۹۵۳ء

تاریخ اودھ :۔ نجم الغنی ۔ مطبع نولکشور ۔ سنہ ۱۹۱۹ء

تاریخ اورنگ زیب جلد سوم (انگریزی) ایم ۔ سی ۔ سرکار اینڈ سنز ۔ کلکتہ

تاریخ محمدی (قلمی ۔ رام پور) مرزا محمد حارث ۔

تذکرۃ الشعراء (قلمی ۔ رام پور) اشرف علی خاں سنہ تالیف سنہ ۱۱۶۸ھ

تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی ۔ علیگڈھ) سعادت خاں ناصر لکھنوی

تذکرہ عشقی (دو تذکرے) کلیم الدین احمد

تذکرہ ہمایون و اکبر :۔ بایزید بیات ۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال سنہ ۱۹۴۱ء

تذکرہ شاہ کمال (قلمی ۔ سالار جنگ) شاہ کمال الدین کمال ۔

تذکرہ ہندی گویاں :۔ غلام ہمدانی مصحفی۔ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۳ء
جام جہاں نما (قلمی رامپور) قدرت اللہ صدیقی۔
حیات طیبہ :۔ مرزا حیرت دہلوی۔ ثنائی برقی پریس۔ امرتسر ۱۹۳۳ء
خریطۂ جواہر :۔ مرزا مظہر جانجاناں۔ مطبع مصطفائی کانپور ۱۸۴۷ء
خزینۃ الاصفیا :۔ مفتی غلام سرور۔ مطبع نول کشور۔
دریائے لطافت :۔ انشاء اللہ خاں۔ چھاپہ خانہ آفتاب عالمتاب، مرشد آباد ۱۲۶۶ء
دستور الفصاحت :۔ مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی۔ سلسلۂ مطبوعات کتاب خانہ رامپور۔ ۱۹۴۳ء
سفینۂ خوش گو (قلمی۔ پٹنہ) بندرابن راقم خوش گو۔
شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات :۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ سلسلۂ تصانیف مشائخ۔ ۱۹۵۰ء
طبقات الشعراء (قلمی۔ آصفیہ) قدرت اللہ شوق سنہ تالیف ۱۱۸۸ھ
فخر الطالبین (قلمی) سید نور الدین حسین مملوکہ خلیق احمد نظامی۔
قواعدِ فخریہ (قلمی) عیوض علی مملوکہ حسن نظامی۔
گلشنِ سخن (قلمی) (علیگڑھ) مردان علی خاں مبتلاؔ۔
مآثر الامراء جلد اول و دوم و سوم۔ شاہنواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ ۱۸۸۸ء
مجمع النفائس (قلمی رامپور) سراج الدین علی خاں آرزوؔ۔
مختصر تاریخ ہندوستان :۔ محمد وحید اللہ۔ مطبع احمدی۔ ۱۲۷۰ھ
مخزنِ نکات :۔ قیام الدین قائم۔ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد۔ ۱۹۲۹ء

مرقع دہلی :۔ درگاہ قلی خاں۔

مرزا مظہر جانجاناں۔ عبدالرزاق قریشی۔ ادبی پبلشرز بمبئی۔ ۱۹۶۰ء

مزارات اولیائے دہلی۔ محمد عالم شاہ فریدی بجید برقی پریس دہلی۔ ۱۹۲۷ء

مضامین عالم گیری۔ شبلی نعمانی۔ مطبع انتظامی کانپور۔ ۱۹۱۱ء

معمولاتِ مظہریہ :۔ نعیم اللہ بہرئچی۔ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۴ء

مغل حکومت کا زوال جلد اول، دوئم، سوم، جادو ناتھ سرکار (انگریزی)
ایم سی سرکار اینڈ سنز کلکتہ

مقامات مظہری :۔ شاہ غلام علی۔ مطبع مجتبائی دہلی۔ ۱۳۰۹ھ

مکتوبات مجدد الف ثانی :۔ مرتبہ نجم الدین اصلاحی۔

مناقب فخریہ (قلمی۔ آصفیہ) نظام الملک۔

منتخب التواریخ :۔ ملا عبدالقادر بدایونی۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ ۱۸۶۸ء

نجیب الدولہ :۔ مرتبہ شیخ عبدالرشید۔ شائع کردہ شعبۂ تاریخ علیگڑھ۔

نشتر عشق (قلمی رام پور) حسین علی خاں عشقی۔

ہماری چند یادگار کتابیں

کتاب	مصنف
عروج و زوال کا الٰہی نظام	مولانا محمد تقی امینی
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر	مولانا محمد تقی امینی
تہذیب کی جدید تشکیل	مولانا محمد تقی امینی
جنگ سیرت نبوی کی روشنی میں	مولانا غلام غوث ہزاروی
ملفوظات حضرت مدنیؒ	ابوالحسن بارہ بنکوی
تفسیر المقام المحمود جلد اول	مولانا عبید اللہ سندھیؒ
مروجہ نظام زمینداری اور اسلام	مولانا محمد طاسن
اسلام کے خلاف یورپی سازشیں	قاضی محمد کفایت اللہ
قرآنی شعور انقلاب	مولانا عبید اللہ سندھیؒ
سرمایہ داری اور جاگیرداری	افضل حق / مناظر احسن